سوانح
مولانا ابوالکلام
آزاد

آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر

مولانا ابوالکلام آزاد

کی سرگرم زندگی کا مرقع

مرتبہ و مؤلفہ

جناب منشی عبدالرحمٰن شیدا پھلواروی

جسے

نونہال بکڈپو کوچہ چیلان دریاگنج دہلی

نے پہلی مرتبہ شائع کیا۔

مشاہیر ہند کے سلسلے کی نہایت ہی مفید ترین کتاب

سیرت مولانا محمد علی رح

بقلم منشی ندیم صہبائی فیروزپوری

جسکو پہلی مرتبہ

نو بہار بکڈپو کوچہ دکھنی رائے دریا گنج دہلی

سے شائع کیا

پریس دہلی

ہدیہ تشکر

ناظرین! میں نے یہ ایک ایسا مبارک اور شاندار قدم اٹھانے کی جرأت کی ہے جس کا میں بوجہ اپنی کم علمی اور محدود معلومات کے خود کو اس قابل نہ سمجھتا تھا اور یہ خیال کبھی تصور میں بھی نہ آیا تھا کہ میں اک روز مولانا ابوالکلام آزاد جیسی جلیل القدر اور بلند پایہ ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنے کا فخر حاصل کر دوں گا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس فخر کے موجب میرے کرمفرما جناب منشی ندیم صہبانی صاحب ہیں جنکی ذات گرامی نے اس دشوار گزار اور گرانمایہ قدم اٹھانے میں میری کافی حوصلہ افزائی کی۔ میں باوجود ناول اور ڈرامے لکھ لینے کے بھی اس وسیع میدان میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ میری علمی کم مائیگی میرے آگے بڑھنے میں حارج نظر آتی تھی۔

مگر میرے اس اظہار پر منشی صاحب موصوف نے جن جادو اثر الفاظ کے ذریعہ مجھے آمادہ کر دیا وہ یقیناً قابل ستائش ہیں۔ آپکے کامیاب انداز پند و نصائح نے میرے لئے اس کام کو آسان بلکہ آسان تر بنا دیا۔ حوصلہ میں بلندی، ارادہ میں استقلال اور طبیعت میں جوش پیدا ہو گیا۔ ولولوں نے اٹھکر تائید کی اور میں نے اس کام کی انجام دہی کا اقرار کر لیا۔

شروع کرنے کے بعد آخر تک حافظے نے دیا اور قلم نے روانی دکھائی لیکن میں خود حیران ہوں۔ لہذا مجھے یہ کہنے سے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس کار دشوار کی تکمیل میں منشی ندیم صہبانی صاحب کی ذات کو وہی امتیازی درجہ حاصل ہے جو فاتح فوج میں اوس کرنیل کو ہوا کرتا ہے چنانچہ اس اعتراف میں منشی صاحب کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔ ذیاراگین - عبدالرحمن شیدا ریواڑی

ہزار ہزار حمد و توصیف اس خلاق دو عالم کو جس نے ہم جیسے نا اہل لوگوں کو صحیح راہ عمل بتانے اور دکھانے کے لئے ایسے ایسے راہبر و رہنما عطا کئے ہیں جو ذی علم، حوصلہ مند، مستقل مزاج۔ پیدائشی ملک و ملت فدائے مذہب و قوم عنصر خود غرضی سے مبرا۔ درد قومی سے سرشار واقف رموز وحدت عالم متبحر، رہبر مستحضر ہونے میں اپنی شان نہیں رکھتے۔

منجملہ متعدد لیڈروں کے جو آسمان سیاست پر وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے مذکورہ صفات بالا سے متصف ایک مولانا ابوالکلام آزاد صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی بھی ہیں جنکی اعلیٰ قابلیت، خارجی خدمت ہمدردی قوم کے درد سے پیدا شدہ پاک جذبات، اور بے مثل ایثار نفس، اس قابل ہیں کہ ہر ہر خوبی کی وضاحت پر الگ الگ ایک ایک کتاب تیار ہو جائے۔ چنانچہ ایسے واجب التعظیم بزرگ کی سوانح حیات اور کارہائے نمایاں سے عام پبلک کو روشناس کرانا ضروری سمجھا جو عرصہ دراز سے اپنے خاندانی بزرگوں کی بے پایاں علمی فضیلت اور روحانی نجابت کا مورث ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی علم و فضل، دانش و حکمت۔ اور سیاست دانی میں بھی یکتائے روزگار ہے۔ چنانچہ یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ ایسی مقتدر، اور عالم متبحر ہستی کی زندگی کے ہر پہلو پر واضح روشنی ڈالنا تو ذرا کار دارد ہے عرض پرداز ہوں کہ اس مختصر سی چند اوراق پر مشتمل کتاب میں حتی الوسع آپ کی صرف مخصوص خوبیاں اور حلوہ کار یاں از ابتدائے عمر تا دم تحریر مجتمع کر دی ہیں۔ اور انشاء اللہ ناظرین اسے زیب ترتیب ہر ضروری پہلو سے کافی تصور کرینگے چونکہ مجھ کو اپنی قابلیت کا کوئی دعویٰ نہیں ہے اور نہ ہی یہ چیز کسی کو زیب دیتی ہے اسلئے ان چند الفاظ کے ساتھ ساتھ مستدعی ہوں کہ اگر کوئی فنی لحاظ سے غلطی یا نقص پائیں تو ازراہ کرم اسے میری کم علمی پر محمول کرتے ہوئے چشم پوشی سے کام لیں۔ فقط۔ احقر رشید ا پلانڈوی

پہلا اڈیشن دہلی

تاریخ اشاعت یکم مئی سنہ ۴۰ء

ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ:۔

نوبہار بکڈپو کوچہ دکھنی رائے دریا گنج دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حال ہی میں نو بہار بک ڈپو سے مشاہیر ہند کے سلسلے کی کتابوں کا سلسلہ جاری ہوا ہے۔ چنانچہ اسی طلائی کڑی کی یہ بھی ایک نہایت ہی مفید اور ضروری کتاب ہے۔ جسے میرے دوست عبدالرحمٰن خاں صاحب شیدا نے نہایت ہی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اس کتاب کو دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ مضمون کی بندش نہایت ہی پاکیزہ اور پیاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ قابل مؤلف نے جہاں تک اس سے ممکن ہوسکا ہے اس نے ہر پہلو پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی شیدا صاحب جس قدر

بھی لکھ دیتے وہ تھوڑا ہی تھا۔ لیکن تھوڑے وقت میں اس قدر جامع کتاب مرتب کر دینا بھی اِن ہی کا کام تھا۔ یہ ضرور تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس سے قبل بھی۔ صدر کانگریس مولانا ابو الکلام آزاد کی زندگی کے متعلق عمدہ سے عمدہ کتابیں چھپ چکی ہوں گی۔ لیکن پھر بھی شیدا صاحب نے اس کو مرتب کر کے نوبہار۔ بکڈپو کی اس کمی کو ضرور پورا کر دیا ہے۔ واقعات اور حالات کا نقشہ جس خوبی کے ساتھ کھینچا ہے وہ قابل تحسین و آفرین ہے۔ شیدا صاحب اس سے قبل بھی ترکی حور نامی کتاب تصنیف فرما کر کافی خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ تالیف دوسرے سابقہ تمام کتابوں سے اشاعت کے لحاظ سے بڑھ جائے گی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہو کہ اس کتاب کے سال میں کئی اڈیشن چھاپنے پڑیں۔ یہ دیکھکر کہ میرے دوست شیدا صاحب کا زور قلم اور ادبی مذاق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے از حد خوشی اور مسرت ہوتی ہے بلیساختہ میری زبان سے یہ ہی نکل جاتا ہے ؏

"اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

عہد حاضرہ میں مولانا ابو الکلام آزاد پر متعدد کتابیں ضرور

لکھی جائیں گی۔ لیکن امید ہے کہ زیر نظر کتاب دوسری کتابوں سے بری ثابت نہ ہوگی۔
معلوم ہوا ہے کہ مؤلف کتاب ہذا کے پاس اس وقت جبکہ اسے ترتیب دیا ہے مواد بالکل کم تھا۔ کاش اگر وہ چند کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو مرتب کرتے تو ضرور اس کتاب میں اور بھی چار چاند لگ جاتے۔ پھر بھی میرے خیال کے مطابق اس میں نمایاں کمی بھی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کتاب ان مشتاقان آزاد کے لئے جو آپ کی زندگی کے حالات پڑھنا چاہتے ہیں ضرور نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔ اور وہ طبقہ جو مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ مانوس ہے نہایت ہی سرگرمی اور جوش استقبال کے ساتھ اس کو نوازیں گے۔
مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس کی قابلیت علمیت اور فضیلت دنیا اور دنیا والوں پر روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ اس میں کسی کو بھی کلام نہیں ہوسکتا۔ آپ نے جس عمر میں علم و ادب کی خدمت کا کام انجام دینا شروع کیا ہے شاید ہندوستان میں اس سے قبل کوئی بھی انجام نہ دے سکا ہوگا۔
مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی خدمت وطن کے لیے

وقف ہے۔ جب سے آپ نے میدان سیاست میں قدم رکھا ہے جب سے آپ ایک مستقل مزاج ہیرو کی طرح برابر سینہ سپر کئے ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنی تمام گذشتہ زندگی میں کبھی بھی کسی میدان سے اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے دل میں خدمت وطن اور خدمت قوم کا شوق اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جس کے متعلق کچھ تحریر کرنا گویا نقل اتارنا ہے۔

سیاسی جماعتوں میں جو آپ کو موجودہ دور میں شہرت دوام حاصل ہے وہ قابل فخر ہے۔ آپ نے صرف وطنی اور قومی خدمت ہی انجام نہیں دی بلکہ جہاں تک بھی ممکن ہوا ہے۔ آپ نے دنیا اسلام کی بھی برابر خدمت انجام دی

تفسیر القرآن۔ جو آپ کے قلم کی جادو نگاری کا کرشمہ ہے۔ وہ حقیقت میں اسی قابل ہے کہ اسکو آب زر سے لکھا جائے۔ آج تک آپ جیسی جامع مدلل اور عظیم الشان تفسیر نہیں لکھی جا سکی۔

قوم اپنے اس محسن اور ہمدرد کو ابھی اچھی طرح سے پہچانتی ہے۔ مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک بلند پایہ ادیب۔ بزرگ ہستی قابل یادگار انسان ہیں

بزرگی اور علم و فضل کا کمال آپ نے اپنی وراثت میں پایا ہے۔
مولانا ابوالکلام آزاد کے بزرگوار اس قابل ہیں کہ جن کے نام نامی و اسم گرامی اس وقت تاریخی اوراق میں محفوظ ہیں رہیں گے جب تک کہ یہ دنیا قائم ہے۔ گو ان دنوں سیاسی کشمکش ضرور ہے لیکن امید ہے کہ ایک دن ایسا بھی ضرور آئے گا جبکہ آپ ہی کوششوں کے ذریعہ یہ اختلاف بھی دور ہو جائے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نہایت ہی خوش مزاج۔ کم سخن ہیں۔ آپ ہمیشہ سادہ لباس میں رہتے ہیں۔ بفضل تعالےٰ بزرگی آپ کے چہرۂ انور ہی سے صاف ٹپکتی ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مولانا ابوالکلام آزاد زمانے کے ساتھ ہی ساتھ چمکتے ہی چلے گئے۔

آل انڈیا نیشنل کانگریس کی صدارت

کا

ممتاز عہدہ

آج دنیا کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس ہے جس میں نہ صرف ہندو ہی شامل ہیں بلکہ مسلمان اور دوسری قومیں بھی اس میں موجود ہیں اتنی بڑی عظیم الشان سیاسی جماعت کی صدارت کے انتخاب کے لئے آپ کا نام لیا جانا آپ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اہل آپ کو ایک قابل قدر ہستی خیال کئے ہوئے تھے۔

آپ اس سال آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر انتخاب کر لیئے گئے ہیں رام گڈھ کانگریس کے

سالانہ اجلاس کے موقعہ پر مولانا ابوالکلام آزاد
نے پنڈال میں جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ ہندوستان
کے طول وعرض سے شائع ہونے والے اخبار اور
رسائل کی زینت بن کر عوام کے قلوب تک پہونچ گیا
ہے۔

مؤلف کتاب ہذا نے نہ صرف آپ کی زندگی کے
حالات کو اختصار کے ساتھ جمع کیا ہے بلکہ رامگڈھ
کانگریس کے سالانہ اجلاس میں جو خطبۂ صدارت
پڑھا گیا اس کو بھی اس کتاب کی زینت کے لئے
شامل کر دیا ہے۔

ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعت کانگریس
کی صدارت کے عہدے پر ممتاز ہونا کوئی معمولی
کام نہیں ہے۔ عوام کو امید ہے کہ آپ کی صدارت
میں یہ سیاسی جماعت خوب ترقی کر سکے گی مسلمانوں
کی نگاہیں بھی مولانا موصوف پر لگی ہوئی ہیں۔ اور تمام
ہندوستان یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب اور بے قرار
ہے کہ آپ اس وطن عزیز کے مفاد کی خاطر
کون سی حکمت عملی سے کام لیتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد صحافت نگاری میں ممتاز درجہ

رکھتے ہیں۔ آپ کے ٹھوس اور جامع مضامین
آج سے کئی سال قبل دنیا پر آپ کے زور قلم اور سحر نگاری
کا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔

الہلال کیا ہے؟ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مشہور اور مقبول عام اخبار تھا جس کے پرانے پرچے ابھی تک ہندوستانی
مسلمانوں نے اس طرح حفاظت سے اپنے سینے سے لگا کر رکھ
لیے ہیں کہ وہ ان کو جدا تک کرنا گوارا نہیں کر سکتے۔
الہلال کے سوا ایسا کوئی اخبار بہت کم نظر آئیگا کہ جس کے
پرانے فائیل اب تک پڑھنے والوں نے سنبھال کر رکھ چھوڑے ہیں

ایسا کیوں کیا گیا؟ قاعدہ ہے کہ ہر شخص گرانبہا اور نایاب چیز کو سنبھال کر رکھتی ہے آپ کے
مضامین خود یہ ظاہر کر چکے تھے کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں
مسلمانوں میں اخبار الہلال کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور
اس کی اشاعت اتنی سرعت سے بڑھی کہ لوگ حیران رہ گئے
قابل مؤلف نے ان تمام باتوں کو بالکل واضح طور پر اس
کتاب میں بیان کر دیا ہے جس کے مطالعہ سے عام
لوگوں کو آپ سے پوری پوری واقفیت حاصل
ہو جائے گی اور وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں گے
کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے موجودہ صدر کس شان و شوکت

کے قابل فخر انسان ہیں۔

عوام کو چاہیئے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات سے استفادہ حاصل کریں اور یہ بھی سیکھیں کہ وطن اور قوم کی خدمت کرنا انسان کے لیئے کہاں تک ضروری اور لازمی ہے۔ شیدا صاحب نے اس کتاب کو مرتب کر کے واقعی احسان کیا ہے مجھ کو امید ہے کہ کتاب ہٰذا۔ تھوڑے ہی عرصے میں گھر گھر پہنچ جائے گی۔ علاوہ ازیں مؤلف صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی وقتاً فوقتاً جو کچھ مولانا ابوالکلام آزاد کے مختلف معلومات حاصل ہو سکے گی وہ تمام جمع کر کے اس کتاب کے دوسرے اڈیشن میں شامل کر دی جائے گی۔

زیر نظر کتاب کا ہر اڈیشن مضمون کے لحاظ سے برابر جامع بنتا چلا جائے گا۔ اگرچہ کتاب ہٰذا کی تالیف میں عجلت اور سرعت سے کام لیا گیا ہے۔ اور وعدے کے مطابق انھوں نے ختم کر کے مرحمت فرما دیا ہے لیکن پھر بھی اس میں کوئی نمایاں خامی نظر نہیں آتی میں امید کرتا ہوں کہ مشاہیر ہند کے سلسلے کی نئی کتابوں کے ذریعہ آپ ضرور استفادہ حاصل کریں گے۔

امید کی جا سکتی ہے کہ یہ جو قدم اٹھایا گیا ہے یہ ضرور مستحسن ثابت ہوگا۔ قارئین کرام نے یہ سلسلہ پسند کیا تو اور بھی بہت سی کتابیں جلد از جلد پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حال ہی میں

سیرت ڈاکٹر اقبال   سیرت مولانا محمد علی

بھی شائع ہو چکی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد سیرت مولانا حالی کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔ غرض یہ کہ مشاہیر ہند کے حالات زندگی کا مطالعہ ہر حالت میں ہندوستانی بھائیوں کے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ترقی کرنے کے طریقے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی پتہ لگ سکتا ہے کہ ایک شخص جو ترقی کرنا چاہے۔ وہ کیونکر تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ عوام کی خواہشات کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔ اور اب اسکو نوازنا آپ کا کام ہے۔ زیر نظر کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔

الراقم

ندیم صہبائی۔ فیروزپوری۔ دریا گنج دہلی

مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۴۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا ابوالکلام آزاد

کے

خاندان سے تعارف

اس سے پہلے کہ زمانہ موجودہ کے ممتاز علمی مذہبی اور صحیح معنوں میں قومی و ملکی لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی (جو ایک مشہور سیاست داں، اعلیٰ درجہ کے مقرر، باثر مقرر اور زبردست ایسے اہل قلم ہیں جن کی تصانیف علاوہ دیگر مضامین کے زیادہ تر دینیات پر مشتمل ہیں جن میں تفسیر القرآن خاص طور پر قابل ذکر ہے) کی سوانح حیات شروع کروں۔ بہتر ہے کہ اپنی کم علمی و بے بضاعتی کی حد تک جو کچھ آپ کے خاندانی اور نسبی حالات سے واقفیت بہم پہنچ سکی ہے پیش ناظرین کر دوں جس کا اظہار مولانا موصوف کی اعلیٰ شخصیت سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو صحیح معنوں میں تعارف ثابت ہوگا۔ اور ہر شخص سمجھ سکیگا۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد صرف اپنی اعلیٰ علمی قابلیت اور خداداد ذہنیت ہی کی وجہ سے نہیں۔

بلکہ نجابتِ حسب ونسب اور عالی خاندانی کی بزرگی وشرف بھی اس پر مجبور کرتی ہے کہ ایسے ستودہ صفات شخص کی رہبری کو مشعلِ ہدایت بنائیں۔

غالباً اس کے مطالعہ کے بعد اگر بنظرِ انصاف اور حقیقت شناس طریق پر کہا جائے تو میدانِ سیاست کا ہر جوان متمنی اور خواہشمند ہو جائے گا کہ وہ ایسے منجھے ہوئے اسباقِ رہنمائی سے استفادہ حاصل کرے۔ جو اس راہبر کو ایسے غیور، بہادر، اور آزاد راے اسلاف سے ورثہ میں ملے ہیں۔ جن میں بہت سے اولیاء صفت بھی ہو گذرے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے جدِ اعلیٰ

آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں کے ذریعہ سے اپنے زمانہ کے علماء فضلاء میں ممتاز درجہ رکھنے والے ایک بہت بڑے عالم وفاضل اور مذہبی حیثیت سے پرہیزگار، متقی، باعمل، عالمِ دین شیخ جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی سے ملتا ہے۔ جو شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں ایک عالم معتبر اور صاحبِ طریقہ بزرگ تھے۔ اور جن کو فیضِ روحانی حضرت شیخ محمد داؤد سے اور علمی فیضان سید رفیع الدین شیرازی سے حاصل ہوا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ ہندوستان میں دربارِ اکبری بامِ عروج پر تھا۔ ہندوستان کے ہر چہار طرف نقارۂ اکبری بڑی جاہ و تمکنت

اور وقار سے سج رہا تھا۔ تمام ہند کے راجگان اطاعت گذار رؤسا کی حیثیت ہی سے نہیں۔ بلکہ بہت سے دُنیاوی رشتہ کی بندش میں بندھ کر اکبری جھنڈے کو اپنا جھنڈا اور اکبری وقار کو اپنا وقار سمجھتے تھے۔

اکبری دربار، جہاں ایک طرف عربی، ایرانی اور افغانی سرداروں سے مُزین تھا۔ تو دوسری طرف ہندوستان کے بانکے اور سجیلے راجپوت۔ سجیلے بہادر اور بانکے راٹھور دربار کا جُزو اعظم بنے نظر آتے تھے۔

اگر ایک طرف بہادر سپاہیوں، دل چلے جوانوں اور فوجی سرداروں کو خدمات اور جانبازی کے سلسلہ میں خلعت، خطاب اور جاگیریں، معافیاں کشادہ دلی کے ساتھ تقسیم ہوتی تھیں تو دُوسری طرف علماء، فضلاء، حکماء اور شعراء کی قدر و منزلت میں بھی سخاوت کا وہی دریا موجیں لیتا اور دُرِ بے بہا لٹاتا نظر آتا تھا۔

فنِ موسیقی، فنِ پہلوانی وغیرہ وغیرہ کی حوصلہ افزائی بھی اس فراخدلی سے کی جاتی تھی۔ کہ مُلک کے دُور دراز حصّوں نیز باہر کے ممالک سے بھی باکمال و باہنر لوگ اُمڈے چلے آتے تھے۔ اور اپنی اُمیدوں سے کہیں زیادہ مستفیض ہوتے تھے۔

دربارِ اکبری کی سخاوت یہیں تک محدود نہ تھی۔ بلکہ موجدوں

بلکہ نجابت حسب ونسب اور عالی خاندانی کی بزرگی وشرف بھی اس پر مجبور کرتی ہے کہ ایسے ستودہ صفات شخص کی رہبری کو مشعلِ ہدایت بنائیں۔

غالباً اس کے مطالعہ کے بعد اگر بنظرِ انصاف اور حقیقت شناس طریق پر کہا جائے تو میدانِ سیاست کا ہر جوان متمنی اور خواہشمند ہو جائے گا کہ وہ ایسے منجھے ہوئے اسباقِ رہنمائی سے استفادہ حاصل کرے۔ جو اس راہبر کو ایسے غیور، بہادر، اور آزاد رائے اسلاف سے ورثہ میں ملے ہیں۔ جن میں بہت سے اولیاء صفت بھی ہو گذرے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے جدِ اعلیٰ

آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں کے ذریعہ سے اپنے زمانہ کے علماء فضلاء میں ممتاز درجہ رکھنے والے ایک بہت بڑے عالم و فاضل اور مذہبی حیثیت سے پرہیزگار، متقی، باعمل، عالمِ دین شیخ جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی سے ملتا ہے۔ جو شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں ایک عالم معتبر اور صاحب طریقہ بزرگ تھے۔ اور جن کو فیضِ روحانی حضرت شیخ محمد داؤد سے اور علمی فیضان سید رفیع الدین شیرازی سے حاصل ہوا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ ہندوستان میں دربارِ اکبری بامِ عروج پر تھا۔ ہندوستان کے ہر چہار طرف نقارۂ اکبری بڑی جاہ و تمکنت

اور وقار سے بج رہا تھا۔ تمام ہند کے راجگان اطاعت گذار رؤسا کی حیثیت ہی سے نہیں۔ بلکہ بہت سے دُنیاوی رشتہ کی بندش میں بندھ کر اکبری جھنڈے کو اپنا جھنڈا اور اکبری وقار کو اپنا وقار سمجھتے تھے۔

اکبری دربار، جہاں ایک طرف عربی، ایرانی اور افغانی سرداروں سے مُزین تھا۔ تو دوسری طرف ہندوستان کے بانکے اور چھبیلے راجپوت۔ سجیلے بہادر اور بانکے راٹھور دربار کا جُزوِ اعظم بنے نظر آتے تھے۔

اگر ایک طرف بہادر سپاہیوں، دل چلے جوانوں اور فوجی سرداروں کو خدمات اور جانبازی کے سلسلہ میں خلعت، خطاب اور جاگیریں، معافیاں کشادہ دلی کے ساتھ تقسیم ہوتی تھیں تو دُوسری طرف علماء، فضلاء، حکماء اور شعراء کی قدرو منزلت میں بھی سخاوت کا وہی دریا موجیں لیتا اور دُرِ بے بہا لٹاتا نظر آتا تھا۔

فنِ موسیقی، فنِ پہلوانی وغیرہ وغیرہ کی حوصلہ افزائی بھی اس فراخدلی سے کی جاتی تھی۔ کہ مُلک کے دُور دراز حصوں نیز باہر کے ممالک سے بھی باکمال و باہُنر لوگ اُمڈے چلے آتے تھے۔ اور اپنی اُمیدوں سے کہیں زیادہ مستفیض ہوتے تھے۔ دربارِ اکبری کی سخاوت یہیں تک محدود نہ تھی۔ بلکہ موحدوں

اور صناعوں کی اُمیدوں کا بھی اسی طرح گہوارہ تھا جس طرح دوسرے باکمال لوگوں کا۔

ہندی، افغانی، ایرانی اور دیگر بہت سے ممالک کی خوبصورت کنیزیں دربارِ اکبری کی رونق کو دوبالا کر رہی تھیں۔

غرضکہ اُس وقت جبکہ ہندوستان جنت نشان مشہور تھا۔ ہر قسم کے باکمال لوگ اور ہر قسم کی قابل و بزرگ ہستیاں دربارِ اکبری کی زینت و رونق تھیں۔ اور ایسے باکمال لوگوں کے لئے عموماً اور طبقۂ علماء کے لئے خصوصاً اکبری سخاوت کا دروازہ اور اس حکومت کی آغوشِ مراحمانہ ہر وقت کھلی رہتی تھی۔

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ منجملہ دیگر تمام اہلِ فن و کمال کے علماء، شیوخ اور صوفیائے کرام کی قدر و منزلت بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔

شاہی دستِ سخاوت اس طبقہ پر بڑی سے بڑی بخشش و عطا کرنے میں بہت زیادہ کشادہ تھا۔ جو بزرگ، اہلِ علم، اہلِ قلم یا صوفی صفت ہستی دہلی میں داخل ہوئی۔ وہ فوراً ہاتھوں ہاتھ عزت و وقعت سے لیجائی۔ اور اس کے حسبِ مراتب و حسبِ لیاقت مشاہرہ، جاگیر یا منصب عطا ہوتا۔

چنانچہ جب اکبری علم دوستی کی شہرت ہندوستان سے بھی باہر نکل کر ایران، افغانستان اور بلادِ عرب تک پہنچی۔ تو ہر مملکت

اور ہر علاقوں سے قابل ہستیاں کشش مقناطیس کی طرح کھنچ کھنچ کر
عازم ہندوستان ہونے لگیں۔ اور صاحب کمال و تشنہ گان علم
اس علم پرور فضا میں مستقل طور پر مقیم ہونے لگے۔ چنانچہ مولانا
ابوالکلام آزاد کے جدِ اعلیٰ حضرت مولانا شیخ جمال الدین کو بھی
دربار اکبری کا علمی ذوق و شوق اور اس کی بڑھتی ہوئی روانی
کھینچے بغیر نہ رہ سکی۔ لہٰذا یہی وہ شیخ جمال الدین رح ہیں جن کا
ذکر اوپر آچکا ہے۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا سلسلۂ نسب
چند واسطوں کے ذریعہ سے آپ تک بھی جا ملتا ہے۔ اب ان
کا ذکر ذرا آگے چلکر اپنے وقت پر خلاصہ طور سے کیا جائیگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے والدِ محترم

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کا نام مولانا خیرالدین تھا۔ جو عرصہ دراز سے اپنے بزرگانِ سلف کی پیروی کرتے ہوئے ہندوستان میں بلکہ خاص دہلی میں مقیم تھے۔ گو اس خاندان کے عرصہ مدید سے ہندوستان میں مقیم ہونے کے سبب اب مولانا آزاد کا آبائی وطن دہلی کہلایا جانے لگا تھا۔ مگر درحقیقت آپ کا خاندان حجاز کے ممتاز خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔

مولانا خیرالدین کے وقت میں ہندوستان کی حالت

مولانا خیرالدین نہایت اطمینان اور آرام کی زندگی گذار رہے تھے۔

مسلم حکومت کے زیر سایہ ہر قسم کی مذہبی آزادی میسر تھی ضروریات دنیوی میں اس قدر استغنا حاصل تھا۔ کہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ اور سب خرخشوں سے مبرا ہو کر صرف عبادت خداوندی کو شغل قرار دیا ہوا تھا۔
یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں تاجدار مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ بادشاہ اپنے اسلاف کی خون بہا کر حاصل کی ہوئی وسیع و بسیط سلطنت کے آخری سانس گن رہا تھا۔ ملک میں ہر طرف شورش اور لوٹ مار برپا تھی۔ انتظام ملکی قریب قریب بگڑ چکا تھا۔ جدھر دیکھو چھوٹا بڑا رئیس، نواب اور جاگیردار خود مختارانہ حیثیت لئے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہر طرف ہماہمی کا دور دورہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وقار اب ملک کے ہر چہار سمت دن دونا رات چوگنا بڑھتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک تو پہنچی کہ بہادر شاہ ظفر بادشاہ کا حکم صرف قلعۂ دہلی کی چہار دیواری تک محدود سمجھا جانے لگا۔ اور قلعہ کی چہار دیواری کے باہر ایسٹ انڈیا کمپنی کا حکم چلتا تھا۔ رفتہ رفتہ ملکی حالت بگڑتی جانے لگی۔ اور اہل ملک عنقریب کسی انقلاب کا خواب دیکھنے لگے۔ اور یقین ہو چلا کہ نہ معلوم کب وہ وقت آجائے کہ ہم رات کو بہادر شاہی حکومت چھوڑ کر سوئیں۔ اور صبح کو اٹھیں۔ تو دوسری طاقت دوسرا انتظام دوسری پالیسی تخت و تاج اور ملک پر قابض نظر آئے۔

اس چلا علی کے نقشہ میں قریب قریب ہر متنفس بجیین نظر آتا تھا۔ مگر پھر کچھ ڈھارس مزید بندھی ہوئی تھی۔ کہ ابھی خاندان مغلیہ کا چراغ روشن ہے۔ خواہ ٹمٹماتی ہوئی حالت ہی میں سہی ۔ مگر برسرِ اقتدار و حکومت ضرور ہے۔ خصوصاً وہ افراد جنہیں خاص طور پر بارگاہِ عالیہ میں دسترس اور پہونچ تھی۔ اور جنہیں شاہی حمایت و اعانت حاصل تھی۔ قریب قریب مطمئن نظر آتے تھے۔

چنانچہ ایسے دو رنگے دَور میں مولانا خیر الدین صاحب دہلی میں موجود تھے۔ کہ اچانک ۱۸۵۷ء میں غدر رُونما ہُوا ۔ اور ایسا قیامت آفریں منظر نگاہوں نے دیکھا کہ الاماں والحفیظ ۔

ہر طرف قتل و غارت اور لُوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ چھوٹے چھوٹے شیر خوار بچے بیرحمی سے گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ مجبور و بیکس عورتیں بے حُرمتی اور ذلّت کا شکار ہوئیں۔ بُوڑھے اور ضعیف لوگ ٹھوکروں میں روندے جانے لگے۔ جوان اور طاقتور گرفتار کر کر کے تلوار کے گھاٹ اُتارے جانے لگے۔ مقتدر اور بااثر ہستیاں چُن چُن کر ختم کی جانے لگیں۔ مال و دولت دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ بازار میں بھگڈر اور لُوٹ کا نقشہ ایسا جما کہ عرصہ تک یہ آگ نہ بُجھ سکی۔ گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہنے لگیں اور قلعہ دہلی باوجود نمکخوران و جاں نثاران کی انتہائی جدّوجہد کے آخر کار خالی ہو ہی گیا۔

اس نفسا نفسی کے عالم میں بشمار قابلِ قدر ہستیاں ختم ہو گئیں۔ اور جو بچیں وہ صرف بقائے زندگی کے سبب۔ کیونکہ قاعدہ کے تحت ہر نئی آنیوالی حکومت فطرتاً اور ضرورتاً اپنی حاکمانہ پالیسی کو فوری عام کرنا چاہتی ہے۔ خواہ وہ صُلح و آشتی کے ذریعہ ہو۔ خواہ بجبر و اکراہ۔ اب اگر اس ملک کے لوگ دُور اندیشی اور سنجیدگی سے کام لیں۔ تو نئی پالیسی، نئی حکومت، اور اس کے نئے انتظامات و استحکامات کو نرمی اور خوشی سے منظور کر لیتے ہیں۔ اور اگر بدقسمتی سے اپنی آتشِ غضب اور اشتعال کو نہ دبا سکیں۔ تو سخت سے سخت سزائیں لمبی لمبی جیلیں۔ اور زیادہ سنگین جُرم ثابت ہونے کی صورت میں جان تک کی قربانیاں دینی پڑ جاتی ہیں۔ اور حکومت کے اربابِ حل و عقد ایسے نازک اور اہم دَور میں ذرا سے شُبہ پر بھی پھانسی پر لٹکا دیتے ہیں حق بجانب ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت امن و امان قائم کرنے۔ اور اپنی حاکمانہ ہستی کا اعتراف کرانے کا فی زمانہ یہی علاج رہ گیا ہے کہ سختی سے کام لیا جائے۔

کاش وہ قومیں اور حکومتیں جن کی کتابِ سیاست میں محکوم اقوام کو قابو میں لانے کا ذریعہ صرف تلوار اور جبر ہی لکھا ہوا ہے اسلام کے زرّیں احکام سے سبق لیتیں اور سیاستِ اسلامی سے اس کا جواب مانگتیں۔ تو معلوم ہو جاتا کہ اسلامی سیاست محکوم لوگوں کو لوہے کی تلوار سے مطیع و فرمانبردار کرنا نہیں سکھاتی۔

بلکہ وہ اخلاق کی شمشیر سے سرکش اور باغیوں کو سرنگوں کرنے کی رائے دیتی ہے۔ اور مشاہدہ نے بتایا ہے۔ اور اب تو خود غیر مسلم مدبرین عقلاء بھی معترف ہوتے جاتے ہیں کہ واقعاً یہ طریقہ بہتر ہی نہیں بلکہ بہترین طور پر کامیاب ثابت ہوتا رہا۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس بلا کسی شائبہ کے اسی طرح کامیاب ہوتا رہیگا۔ چنانچہ یہ امر مسلّم ہے کہ تلوار یا جبر اپنی سفاکی و بیرحمی کے بہت سے سر بھی جھکا نہیں سکتی۔ اور اخلاق سر ہی نہیں، دلوں کو بھی مسخّر و مطیع کر لیتا ہے۔ لہٰذا یہ تعلیم بفضلہ تعالےٰ اسلام اور صرف اسلام ہی دیتا ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں اس وقت مذکورہ بالا واقعات کے ہوتے ہوئے کوئی آزاد رائے اور ملک و ملت کا درد رکھنے والا یہ بھی گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اس کے آزاد ضمیر کی آزاد آواز کو جبراً یا کسی مادّی لالچ کی بناء پر خرید کر غلط طور پر استعمال کیا جائے۔ لہٰذا اس کا علاج صرف یہی تھا۔ کہ جانِ عزیز کو لیکر یہاں سے ہجرت کر جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ مولانا خیرالدین صاحب بھی کیثر قربانیوں کے بعد جبکہ غدر کا یہ قیامت فرسا رنگ کچھ کم ہو چلا تھا۔ تو ملک کی تباہی و بربادی اور عبرتناک مناظر سے دل برداشتہ ہو کر حجازِ مقدس کی طرف چلے گئے۔ اور مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی

پیدائش

پورے اکتیس برس بعد اسی مقدس سرزمین اور متبرک خاک کے ذروں میں مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء

مطابق ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔

اس سے پہلے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات کو یہیں سے شروع کر دیا جائے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان کے اُن برگزیدہ بزرگوں سے تعارف کرا دیا جائے۔ جو اس خاندان کے روشن چراغ اور درخشاں ستارے علم و فضل اور معرفت و طریقت کی وجہ سے شہرت و عزت کا خراج حاصل کر چکے تھے۔ (آپ کی ننھیال و ددھیال دونوں طرف کتنے ہی عقل و دانش اور تدبّر کے علاوہ رُوحانیت میں بھی سر کردۂ روزگار رہتے۔) تاکہ مولانا آزاد کی قدر و منزلت اور اعلیٰ شخصیت کا صحیح نقشہ نظر آ سکے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد بزرگوار مولانا خیرالدین صاحب کی شخصیت و بزرگی اور اُن کے زمانہ سے تو آپ واقف ہو چکے ہیں۔ اب اس خاندان کے دوسرے ایسے ہی افراد سے تعارف کرایا جاتا ہے جو فخرِ خاندان ہونیکے علاوہ برگزیدہ اولیاء، علماء، شیوخ و صوفیائے کرام جیسے ممتاز درجات حاصل کرتے ہوئے عمل پیرا ہوتے رہے۔ اور جن کی روحانیت و علمی استعداد کی بدولت درس و تدریس اور روحانی فیضان کا چشمہ صدیوں تک جاری رہا۔ اور زمزمِ معرفت کے تشنہ لب و تشنہ دہن جس کے آبِ زلال سے مدتوں تک اپنی پیاس بجھاتے

رہے۔ اور آخر میں جن کا سلسلہ مولانا ابو الکلام آزاد تک پہنچتا ہے۔

مولانا ابوالکلام کی والدہ محترمہ

مولانا آزاد کے والد بزرگوار مولانا خیرالدین اگر ایک بزرگ اور صاحب طریقت شمار ہوتے تھے۔ تو دوسری طرف مولانا آزاد کی والدۂ ماجدہ بھی کئی ایک جلیل القدر صوفیائے کرام اور علمائے دہر بزرگوں کی اولاد ہونے کا فخر رکھتی تھیں۔ آپ کے خاندان میں بھی کئی ایسی نادرِ روزگار ہستیاں ہو گذری ہیں جن کی ذات گرامی آج ایک زمانہ کو بجا طور پر فخر و ناز ہے۔

آپ خود مدینہ منورہ جسے عروس البلاد بھی کہا جاتا ہے۔ کے ایک مشہور اور ممتاز خاندان کی ایک صاحبزادی تھیں۔ جسے شیخ بن طاہر مدنی کہتے ہیں۔

شیخ بن طاہر مدنی

حضرت شیخ بن طاہر مولانا آزاد کے گویا نانا ہوتے تھے۔ ان کی بزرگی اور قدر و منزلت کا بآسانی اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ مدینہ منورہ جیسے پاک اور مقدس شہر کے مفتی تھے علاوہ ازیں آپ گذشتہ دور کے اکثر علمائے حجاز میں سے سربر آوردہ، اور مکہ معظمہ یا بیت اللہ شریف کے آخری مورث ہونے کا صحیح فخر حاصل تھا بلاشک

بہر دو مدارج ممتاز حیثیت انہیں اشخاص ہی کا حصہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے دادا حضرت محمد ہادی صاحب

مولانا محمد ہادی صاحب مولانا آزاد کے حقیقی دادا اور مولانا خیر الدین کے والد تھے۔ آپ بھی دہلی کے طبقۂ علماء و فضلاء سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنے وقت کے با اثر شیخ و بزرگ شمار کیے جاتے تھے۔ دنیوی عزت و وقار اور جاہ و حشمت جو علمی فضیلت کا صدقہ تھی۔ دریبہ ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔

حضرت شاہ محمد افضل صاحب

حضرت شاہ محمد افضل صاحب مولانا آزاد کے پردادا یعنی حضرت محمد ہادی کے والد تھے۔ یہ بھی اپنے وقت کے ایک مجتہد، عالم متبحر، صوفی باصفا اور خادم خلق اللہ گزرے ہیں جن کے فیوض و برکات سے استفادہ کرنے والی بہت سی ہستیاں بجائے خود قصرِ علمی کے زریں گنبد سے مشہور ہوئی ہیں۔ یہ ہستی بھی اس خاندان کی ایک مایۂ ناز ہستی تھی۔

حضرت شیخ محمد حسن صاحب

حضرت شیخ محمد حسن صاحب حضرت شاہ محمد افضل کے والد تھے۔ یہ بھی علمی فضیلت میں ممتاز رہتی اور فیض رسانی میں ہر دم جاری رہنے والے دریا کی مثال اس قابل گزرے ہیں جو کسی حالت میں بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ گو کتابوں میں ان کا نام زیادہ مشہور نہیں

تاہم بھی چونکہ یہ اس خاندان کے ایک قابل قدر بزرگ ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر کرنا بھی ضروری تھا۔

مولانا منور الدین صاحب

ان کے والد مرحوم کے نانا مولوی منور الدین اپنے عہد کے مشہور استادِ علم وبدرس۔ اور سلسلۂ درس وتدریس کے ماہر کامل اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ بے شمار معتقدین و مریدین کا جمگھٹا ہر وقت گرد رہا کرتا تھا۔ اور رُوحانی فیض ہر دم جاری رہتا تھا۔ ان کی فضیلتِ علمی کا کیا کہنا۔ کم از کم مجھ جیسے کم علم کے لئے تو بہت ہی مشکل ہے کہ اس کی وضاحت کرسکوں۔ تاہم اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور ذکی الطبع ہونے کی وجہ سے دُوسرے ہم سبق ساتھیوں میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔

آپ کی قدر ومنزلت اس حد سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ آپ سلطنت مغلیہ کے شاہ عالم اور اکبر ثانی کے عہدِ حکومت میں آخری رُکن المدرسین یعنی وزیر تعلیمات تھے۔ اس سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ آپ کی علمی استعداد کس قدر بلند تھی۔

مولانا رشید الدین صاحب

مولانا رشید الدین صاحب مولانا منور الدین صاحب کے والد تھے۔ آپ کے قدم دُنیوی وجاہت شب و روز چُومتی اور گھر کی لونڈی تھی۔ دانش و تدبر، سیاست اور علمی ثروت کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ آپ احمد شاہ ابدالی کے عہدِ حکومت میں صوبہ لاہور کے قاضی القضاۃ جیسے جلیل القدر عہدہ پر فائز تھے۔ اور انتہائی خوش اسلوبی متصف مزاجی سے اپنی ڈیوٹی انتہائی کامیابی سے انجام دیتے تھے۔ جس سے احمد شاہ ابدالی نے خوش ہو کر دُوسری ایک ذمہ داری بھی سپرد کر دی تھی۔ وہ یہ کہ آپ کو نائب السلطنت پنجاب کا مشیر اور معتمد خاص مقرر کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ حضرت بھی مولانا آزاد کے خاندان کے نامور اور قابلِ قدر افراد سے تھے۔ جن کی صحیح قدر و منزلت شاہانِ وقت اور علماءِ زمانہ ہی خوب جانتے تھے۔

شیخ صدر الدین صاحب

شیخ صدر الدین صاحب مولانا رشید الدین کے دادا ہوتے تھے۔ آپ کی علمیت اور قابلیت کا شہرہ اتنا بلند تھا کہ آپ افغانستان کے مشہور شہر ہرات کے مشائخ طریقت میں گنے جاتے تھے۔ اور اُن سے ہمعصر علماء و فضلاء اور صوفیائے کرام

آپ کی دل سے وقعت کرتے اور لائق تعظیم سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ محمد صاحب } آپ بھی ایک بڑے پایہ کے بزرگ اور زبردست عالم گزرے ہیں۔ یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ آپ مولانا آزاد کی کتنی پشت اوپر تھے تاہم یہ امر تصدیق شدہ ہے کہ آپ بھی اسی عالم اور صوفی خاندان کے ایک چراغ ہدایت تھے۔ آپ کا وقت جہانگیر بادشاہ کے عہد سے گزرا ہے۔

اور آپ اوس وقت بھی ایک زبردست عالم اور صوفی باصفا گزرے ہیں۔

آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ نے شاہان مغلیہ کے دو تاجداروں کا زمانہ پایا اور وہ دونوں تاجدار بھی کون؟ جن کے وقت میں ہندوستان کے کونہ کونہ سے مغلیہ شاہان وشوکت کا ڈنکہ بج رہا تھا۔ اور خاندان مغلیہ کا بخت پورے عروج پر تھا۔ جبکہ یورپ تک کی بڑی بڑی حکومتیں مغلیہ دربار میں اپنے سفراء بھیجکر دوستی قائم کرنا باعث عزت خیال کرتی تھیں۔ وہ دو تاجدار خاندان مغلیہ کے زبردست اور مشہور بادشاہ ایک جہانگیر جس کا عدل وانصاف آج تک مشہور ہے اور تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ اس طرح نمایاں رہے گا۔ اور دوسرے شاہجہاں صاحب قرآن تھے جس نے لال قلعہ اور جامع مسجد جیسی نادر روزگار اور بے مثل تعمیریں اپنے پایہ تخت دہلی میں زرکثیر خرچ کرکے اک نہ مٹنے والی دینی سعادت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حاصل کرلی۔

کون نہیں جانتا کہ شاہجہاں بادشاہ بذات خود کتنا بڑا عالم اور ایک صوفی صفت بادشاہ تھا۔ اب اگر وہ کسی بزرگ کے آگے زانوے ادب تہہ کرکے خود کو اوسکے زمرہ مریدین میں داخل کرے تو اوس بزرگ کا درجۂ امتیاز اور علمی وسعت اور اوس کے ساتھ ساتھ راہِ طریقت پر کافی عبور کا اندازہ لگائیے چنانچہ یہ فخر بھی مولانا آزاد کے لئے کچھ کم نہیں ہے کہ اوسی شاہجہاں کو جو خود ہر طرح فاضل اجل تھا۔ مولانا آزاد کے ایک خاندانی بزرگ حضرت شیخ محمد صاحب سے شرف بیعت حاصل تھا۔

اب مولانا آزاد اور ان کے جد اعلیٰ حضرت شیخ جمال الدین کے درمیان جو جو متعدد و مقتدر ہستیاں اور علماء، وصوفیاء عظام گزرے ہیں اون کے نام نامی اور مختصر حالات سے آگاہی کردی گئی ہے۔ مگر ان کے علاوہ بھی اور بہت سے نیک طینت و قابل احترام بزرگوں کے نام نامی اس خاندان میں ایسے ملتے ہیں جن کی ذات گرامی سے وقتاً فوقتاً اسلام کو خاطر خواہ فائدہ پہونچتا رہا۔ اور انھوں نے خلائق عامہ کی وہ خدمات انجام دیں جنھیں ایثار و قربانی کا درجہ حاصل ہے۔ علاوہ ازیں سیاسیات پر بھی کافی حصہ لیتے رہے۔ انھیں اسلاف میں کئی ایک ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں۔ مجاہدانہ، راست بازی اور [illegible] میں ضرب المثل ثابت ہوئے ہیں اور جن کی جمہور و حق پرست ہیتوں نے وقتی بادشاہوں کے وقار و دبدبہ سے مرعوب ہوکر یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے ضمیر کی آزادی کو قربان کردیں بلکہ ایسے کئی ایک مواقعات پر اپنی آزادی ضمیر

کو برقرار رکھنے کی خاطر اور سامان تعیش کو جو شاہوں کی طرف سے فراہم تھیں لات مار کر عرب جیسے ریگستانی صحراؤں میں پناہ گزیں ہو گئے اور وہیں عمریں گزار دیں۔

غرض ان قابل قدر ہستیوں کے تعلقات سے مولانا آزاد کی فضیلت و بزرگی اور خاندانی وقعت نمایاں طور پر اس طرح واضح ہے کہ مخالف ترین اشخاص بھی اس خداداد بزرگی اور برتری کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج باوجود سخت مخالفت کے بھی لوگ یہاں گنگ ہیں اور اس خاندانی وقار و منزلت اور مولانا آزاد کی خود کی لیاقت و قابلیت کے آگے خاموش ہیں۔

حضرت شیخ جمال الدین کا دوبارہ ذکر خیر

یہ تو ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ حضرت شیخ جمال الدین شہنشاہ اکبر اعظم کے عہد حکومت میں ایک مانے ہوئے زبردست عالم متبحر اور صاحب طریقت بزرگ تھے جن کا عرف شیخ بہلول دہلوی تھا۔

اس زمانہ میں گو ہندوستان کا پایہ تخت آگرہ تھا اور آگرہ ہی کے قلعہ پر شہنشاہ اکبر اعظم کی رہائش تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی تاریخی شہر دہلی جسے اُمّ البلاد کہنا چاہیئے علم و فن کی مشاطہ اور عروسِ عالم تھے علوم دینی و دنیوی کا مرکز یہی مقام تھا۔ حکمت کا سب سے بڑا مخزن رنگینی و دلربائی کا مسکن۔ اور بادشاہ کے یہاں موجود نہ ہونے پر بھی

اوسی شان و شوکت کا منظر دکھانے والا مقام ہونے کا فخر صرف دہلی ہی کو میسر تھا۔ غرض اس تاریخی شہر کو وہ عروج اور وہ اقبال حاصل تھا جس کی تعریف میں کئی ضخیم کتابیں علیحدہ تیار ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ شیخ صاحب مذکور اسی اُمّ البلاد میں آباد تھے۔

آپ کی بزرگی اور ہر دلعزیزی کا یہ بین ثبوت ہے کہ بزرگان دین اور دنیوی جاہ و حشم کے مالک امراء و وزراء اور اکابرین سلطنت کے علاوہ خود شہنشاہ اکبر اعظم بھی آپ کی بے مثل خوبیوں مثلاً علمی فضیلت واقف رازِ طریقت، قابل تحسین صداقت، اور حیرت انگیز مستقل مزاجی کا ایک دفعہ نہیں بلکہ بارہا اعتراف کر چکا تھا۔

چنانچہ آپ کی صداقت شعاری اور بے لاگ حق گوئی کا اندازہ اس سے لگائیے۔ کہ شہنشاہ اکبر اعظم نے مذہبی اصطلاحات میں کچھ تبدیلیاں کرنی چاہیں جس کے سلسلہ میں "دین الٰہی" مروج کیا۔ خیر یہ تو کچھ ضرر رساں ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ مگر دوسری چیز جس پر چند معدودے افراد پر مشتمل علمارِ حق کی ایک چھوٹی سی جماعت متنفر ہو گئی جس میں آپ بھی شامل تھے۔ اور اس بات کی ذرہ برابر پرواہ نہ کی کہ اس نفرت کے اظہار سے اون کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا یا کیا حالات پیش آئیں گے وہ معاملہ یہ تھا کہ شہنشاہ اکبر نے خود کو "بانی دین الٰہی" ظاہر کرنے کے جواز میں عالمان دین و مفتیان شرع متین سے فتویٰ مانگا جس پر دستخط کرنے سے آپ نے صاف انکار کر دیا۔ اور شہنشاہیت و حکومت کے جاہ و جلال

اور دبدبہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔

یہ ایک بہت بڑی آواز تھی جو حق کو قائم رکھنے اور غلط اٹھے ہوئے قدم کو واپس کرنے کے سلسلہ میں آپ نے پیدا کی۔ خصوصاً جبکہ کوئی بڑی تعداد علمار کی یا کوئی جماعت امراء و زندار کی یا فوجی طاقت کا کوئی حصہ کچھ بھی شامل یا حاصل نہ تھا۔ بلکہ صرف معدودے چند افراد ہمزبان تھے۔ جو طبقہ علمار سے ہی متعلق اور آپ کے معتقدین سے تھے۔

آپ نے دین حقہ میں اس نئی شاخ کو درست و جائز سمجھا اور علی الاعلان اسکی تردید میں چند جملے بادشاہ کے کانوں تک اوس حالت میں پہنچا دیئے جبکہ حکومت کی ہر طاقت ہر نظام اور علمار کی ایک بڑی جماعت حتیٰ کہ پبلک کی عام آواز غرض تمام فضا اوسوقت کی اوس فتویٰ کے موافق تھی مگر جب آپ نے دیکھا کہ بادشاہ پر اس انکار دستخط اور مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ اب بادشاہ کی مذہبی رونق میں فتور آچلا ہے تو حضرت مولانا شیخ جمال الدین عرف شیخ بہلول ترک وطن کرکے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور ارادہ کر لیا کہ اب بقیہ ایام زندگی اسی مقدس سرزمین اور خدا کے گھر کے سایہ میں بسر کروں گا۔

مگر چند سال بعد خان اعظم مرزا عزیز کو کلتاش جنھیں حضرت شیخ صاحب سے انتہائی حسن عقیدت اور فیض طریقت حاصل تھا۔ بارادہ حج مکہ معظمہ آئے اور فریضہ حج سے فارغ ہو کر اپنے دیرینہ بزرگ سے ملاقی ہوئے۔

خادمانہ طور پر سلام و کلام شروع ہوا۔ حضرت شیخ جمال الدین نے خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش سے ازراہ شفقت دربار اکبری کے حالات سے اور شہنشاہ اکبر نیز اپنے معتقدین کی خیریت دریافت کی۔ اوس کے بعد دوسری باتیں ہوا کیں۔

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش مکہ معظمہ سے حضرت شیخ جمال الدین کے آستانہ پر کئی روز مہمان رہے مگر باوجود بسیار کوشش کے بھی حرف مطلب بوجہ ادب زبان پر نہ آسکا۔ آخر کار بہزار دقت انتہائی عجز و انکساری کے پیرایہ میں وہ اشتیاق بھرا مطالبہ پیش کرا ہی دیا جسے مرزا عزیز ایک عرصہ سے سینہ میں دبائے ہوئے تھے۔ وہ یہ کہ آپ اس غلام کے ہمراہ ہندوستان تشریف لے چلیں۔ مگر حضرت شیخ صاحب نے اس سفر سے انکار کر دیا۔

مگر خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کا اصرار بھی کچھ کم اصرار نہ تھا۔ اس بری طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ حضرت شیخ صاحب کو چارو ناچار اقرار کرنا ہی پڑا۔ اور آپ مکہ معظمہ کی سرزمین کو حسرت کی نظر و نظروں سے دیکھتے ہوئے خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی سعی سے اون کے ہمراہ ہی عازم ہندوستان ہو گئے اور دہلی میں دوبارہ آکر اقامت گزیں ہو گئے۔

مگر افسوس یہ سفر آپ کا ایسا سفر ہوا جس کے بعد آپ کو مکہ معظمہ کے مقدس سرزمین دیکھنی نصیب نہ ہوئی اور چند ماہ کے بعد ہی اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولٰنا خیرالدین صاحب کا دوبارہ ذکرِ خیر

یہ ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کی تباہی و بربادی اور عبرتناک مناظر سے دل برداشتہ ہو کر مولانا آزاد کے والد مولٰنا خیرالدین صاحب بھی اپنے خاندان کے جد اعلیٰ کی تقلید میں ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز مقدس کے بلند مرتبہ شہر مکہ معظمہ سے جا کر اقامت گزیں ہو گئے۔ اور اس متبرک مقام پر رہتے رہتے کئی سال گزر گئے تو آپ کے علم و فضل اور کمالِ ظاہری و باطنی کی متواتر شہرت سنتے رہنے سے بالآخر ہو کر ٹرکی کے خود مختار بادشاہ عبدالحمید صاحب نے آپ کو بلانے کی دعوت دی چنانچہ پہلے تو آپ نے اس عذر واقعی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ میں اب گوشہ نشین ہو جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اس لیے معافی کا خواستگار ہوں مگر کبھی اشتیاق بھرے دل بھی مانا کرتے ہیں ؟ اس پر اور زیادہ اصرار ہوا۔ جس کے بعد آپ نے اس شاہی دعوت کو قبول کر لیا اور قسطنطنیہ چلے گئے اور بوجہ شاہی مہمان ہونے کے کافی تزک و احتشام کے ساتھ قسطنطنیہ میں صرف تین سال گزارے یہ سلطان عبدالحمید والیٔ ٹرکی وہی سلطان ہیں جن کے امرا وزرا اتنے غیر معتبر اور غداری جیسی لعنت کے مستحق بنے اور اپنی غداری کا تلخ نتیجہ خود تو اٹھایا ہی مگر آدھی بے پناہ آتش کے بے پناہ شعلوں سے غریب

سلطان عبدالحمید بھی نہ بچ سکے اور انجام یوں ہوا کہ جب اس غداری کی بنا پر اتحادیوں سے ساز باز کر کے ملک و تخت غیروں کے حوالہ کر دینے کی ٹھانی اور چند سرخ و سفید سکوں کی عوض اپنی قدیم جاں نثارانہ وفاداری کو داغ لگا دیا۔ تو اتحادیوں کے فیصلہ کے مطابق یونانیوں کا سمرنا وغیرہ پر قبضہ ہو جانے کی صورت میں وہاں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ لہٰذا یونانیوں کے اس ذلیل ظلم سے مصطفےٰ کمال پاشا اور اس کے غیور ہمراہی اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد اور شہروں کے انتقام کی غرض سے شعلۂ جوالہ بنکر حلب سے اٹھے اور دنیا کے دیکھتے ہی دیکھتے یونان اور اس کے امدادیوں کو وہ یادگار سزا دی کہ تاریخ دنیا میں عموماً اور تاریخ ٹرکی میں خصوصاً زریں الفاظ سے لکھی گئی۔ اور انجام میں سلطان عبدالحمید خاں کو معزول ہونا پڑا۔ مگر جس وقت کا ذکر اسوقت در پیش ہے اوسوقت ترکی میں سلطان عبدالحمید خاں کا طوطی بول رہا تھا۔ گو مخالف جماعتیں اور جمہوریت پسند پارٹیاں پوشیدہ طور پر برابر کام کر رہی تھیں مگر فتح اور کامیابی اسوقت تک شاہی وفاداروں کو میسر تھی غرضیکہ اوس شان دار اور پرشکوہ دور میں آپ نے شاہی مہمان کی طرح اقامت اختیار کی مگر بہت کم عرصہ۔

اس کی وجہ کوئی شاہی رویہ میں تبدیل یا سیاسی مخالفت نہ تھی بلکہ محض ان کی افتاد طبیعت کا تقاضا تھا۔ جو آرام و آسائش کے لئے خلق نہیں ہوئی تھی بلکہ خلق خدا کی خدمت اور فیض روحانی سے دنیا کو مستغنی کرنے کے لئے تخلیق ہوئی تھی۔

آپ اگر چاہتے تو نہایت عزت اور آرام کی زندگی اسی شاہی مہمانی میں گزار دیتے اور لشپت ہا پشت کے لئے خزانہ شاہی و الطاف خسروانہ سے اندوختہ اتنا کافی چھوڑ جاتے کہ آپ کی اولاد بجائے خود ایک بڑی ریاست کی مالک ہوتی مگر اوکھیں ریاست دنیوی کی نہیں بلکہ ریاست دینی کی دھن اور لو لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ کہنا پڑتا ہے کہ

قدرت جنھیں خدمتِ خلق کے لئے منتخب کر لیتی ہے اوکھیں چین کہاں۔ غرض بمشکل تمام تین سال کا عرصہ گزارا اس عرصہ میں اطلاع ملی کہ مکہ معظمہ کی نہر زبیدہ جو عباسیہ خاندان کے خلیفہ ہارون الرشید کی چہیتی اور نیک ملکہ زبیدہ نے اپنے نام کی نسبت سے بنوائی تھی۔ مرمت طلب حالت میں ہے اور اوسکی مرمت کا اقدام کیا اور اپنے ذاتی اثر رسوخ کی بنا پر بہت کم عرصہ میں گیارہ لاکھ روپیہ کی کثیر رقم نہر زبیدہ کی مرمت کے لئے مہیا کر لی۔ اور مرمت کا کام خاطر خواہ انجام دیکر سعادت دارین اور دعائے خلق حاصل کی۔ اور کئی سال کے عرصہ میں اسکی مرمت سے فارغ ہو کر پھر مکہ معظمہ میں ہی مقیم ہو گئے۔ اب وہ زمانہ آیا کہ ہندوستان کی عنان سیاست کو اپنے مدبر ہاتھوں میں لے کر نہایت کامیابی اور ذمہ داری کے ساتھ تھامنے والا نونہال قوم (مولانا ابوالکلام آزاد) پیدا ہوا۔ ادھر ہندوستان میں مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین صاحب نے معتقدین و مریدین کا فی تعداد

میں تھے اور اپنے کرشمہ صفت پیر و مرشد کی جدائی میں بیقرار و بے چین تھے۔ نہر زبیدہ کی مرمت کے ایام دوران میں مشتاقانِ زیارت و تشنہ گان رشد و ہدایت کتنے ہی معروضے خدمت میں پہونچے کہ اب آپ کی جدائی بہت شاق گزر رہی ہے اس لئے شربت دید سے مشرف ہونے کا موقعہ عطا کیجئے۔ چنانچہ آپ ان لوگوں کی پیہم اور متواتر درخواستوں پر ۱۹۰۷ء میں پھر ہندوستان میں تشریف لے آئے۔ اور کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے چشمۂ علم کے ہر دم جاری رہنے والے فیض جاریہ سے جہاں لوگوں کو نہ فانی دولت دینی و دنیاوی سے مالامال کیا وہاں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کر کے موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے کافی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے جن میں وہ زیادہ مقبولیت و شہرت کی مالک ہیں جو دینی مباحثات کے سلسلہ میں مصر میں شائع ہوئیں اور آجتک کتب خانوں اور لائبریریوں اور درسگاہوں میں محفوظ و مامون ہی نہیں بلکہ اون سے کافی استفادات حاصل کیئے جاتے ہیں ؞

مولانا ابو الکلام صاحب آزاد اور انکی پیدائش

مولانا ابو الکلام آزاد جدہلوی کرکے اِس لیئے مشہور ہیں کہ آپ کے خاندان کے افراد نے دہلی میں سکونت اختیار کی دہلی کی فضا میں آزادی کا سانس لیا اور دہلی میں ہی پھلے پھولے خصوصًا مولانا ابو الکلام آزاد کا بذات خود کا کثیر زمانہ دہلی میں گزرا اور اس سے کم کلکتہ میں علاوہ ازیں آپ کا آبائی وطن بھی دہلی اسی لیئے مشہور ہے۔

غالبًا یہی وہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے آپ کو دہلوی کہا اور لکھا جاتا ہے۔ ورنہ پیدائش اور بچپن کا تمام زمانہ عرب اور عرب کے بھی اوس مقدس اور پاک شہر کی ہے جسے مکہ معظمہ کہتے ہیں۔ اوس شخص کی خوش قسمتی اور نیک بختی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اوسکی پیدائش اوس شہر میں ہو جس کے ساتھ تمام مسلمانان عالم کو خواہ وہ کسی طبقہ، کسی گروہ، اور کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ قلبی محبت اور روحانی لگاؤ ہے۔ جس نے دنیا میں آکر پہلا سانس لیا وہ اوس پاکیزہ فضا میں جس میں ہمارے آقا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی تھی۔

جس نے آنکھیں کھول کر اس خطۂ زمین کو دیکھا جو آقائے نامدار کے قدوم
میمنت لزوم سے ایک دو روز نہیں دو چار برس نہیں بلکہ عمر کے آخری حصہ
تک جسمیں آپ نے زندگی کا ہر مرحلہ طے کیا ہو۔ شرفیابی حاصل کر چکی ہو۔ جس نے
اوس مقام کے سیاست و مذہبیت میں نشو ونما پائی ہو۔ جو خالص عربی سیاست
اور صحیح مذہبیت کا مرکز ہو۔ جو بچپن میں اون سنگ ریزوں سے کھیلا ہو جو
حضور اکرم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹھوکریں کھانے کا شرف
پائے ہوئے ہوں۔ اور جس نے کا دہ نہیں لباس وہ رہا ہو جس میں
ہمارے آقا محمد رسول اللہ ملبوس رہا کرتے تھے۔ غرضیکہ ایسی خوش بختی
کو جتنا سراہا جائے اور اوس کی قسمت پر جتنا رشک کیا جائے کم ہے۔
غرضیکہ خدائے قدوس کے پاس گھر کے سایہ میں آپ کی پیدائش ہوئی
اور بچپن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جیسے مقامات مقدسہ میں بسر ہوا۔
تاریخ تو معلوم نہ ہو سکی مگر ماہ ستمبر اور ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ
کی پیدائش معلوم ہوئی ہے۔ اور جو دولت بھی ہے۔ چنانچہ اس سنہ
پیدائش کی رو سے اسوقت جبکہ راقم الحروف اپریل ۱۹۴۲ء میں سوانح حیات
مولانا ابوالکلام آزاد جیسی اہم چیز کو احاطۂ تحریر میں لانے کی جرأت
کر رہا ہے آپ کی عمر پچاس سال اور قریب آٹھ ماہ کے ہوئی ہے جبکہ
آپ خدا کے فضل سے اپنے خاندانی احترام و تقدیس کو جو مسلسل کئی صدیوں
سے چلا آتا ہے اپنے آباؤ اجداد کی طرح برقرار رکھتے ہوئے اپنی عمر عزیز
کا کافی حصہ صحیح رہنمائی میں صرف کر چکے ہیں۔

اب سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاندانی مبارک حالات سکے ہوتے ہوئے جبکہ آپ کو اپنے مدِ شمار سے سوائے بے وث خدمت خلق کرنیکے دوسری چیز نہ ملی ہو۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنی سیاست کی باگ ڈور اون کے ہاتھ میں دیدینے اور اسپر آنکھ بند کرکے بلا کسی حیل و حجت کے آخری منزل تک عمل کرتے رہنے کا یقینی اور حتمی فیصلہ کر لیا ہو۔ مبارکباد کے مستحق نہیں ہیں؟ اور کیا اون کی سیاست و مذہبیت قابل تحسین نہیں جو مکہ معظمہ خصوصًا مدینہ منورہ کی پاکیزہ فضا میں پرورش پائے ہوئے دل و دماغ سے نکاتِ سیاست اور بیت اللہ شریف و مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ اکبر کہنے والی زبان سے رشد و ہدایت حاصل کرتے ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور انکی ابتدائی درس گاہ

مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام محی الدین احمد ہے گو آبائی وطن دہلی ہے مگر خود کی پیدائش چونکہ خاص مکہ معظمہ میں ہوئی ہے اس لیئے اس لیئے آپ عربی کہلانے کے بھی مستحق ہیں۔ آپ کے والد ماجد آپ کو بجائے اس نام کے فیروز بخت بھی کہا کرتے تھے۔ جو در اصل آپ کا تاریخی نام ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا پیدائشی مقام تعلق ہے سنہ وماہ وغیرہ تو مفصل طور پر معلوم ہو چکے اب آپ کا نام و دیگر بچپن کے حالات سے روشناس کراتے ہیں۔

آپ کا خاندانی اور اصل نام محی الدین احمد ہے گو کتب سیر اور دیگر

ذرائع معلومات آپ کا آبائی وطن دہلی بتاتے ہیں اور یہ درست بھی ہے
مگر آپ بذاتِ خود میری رائے کے نزدیک مکہ معظمہ میں پیدائش کے سبب
عربی کہلانے کے بھی مستحق ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار آپکی محی الدین کی بجائے
اکثر فیروز بخت بھی کہا کرتے تھے جو دراصل آپ کا تاریخی نام ہے چونکہ
آپ کی پیدائش ۱۳۰۵ھ ہجری میں ہوئی ہے اس لیئے بحساب ابجد فیروز بخت
کے اعداد ۱۳۰۵ بنتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم اور آپکی حیرت انگیز انتہا

آپکے سب سے پہلے معلم آپ کے والد صاحب
مولانا خیر الدین ہی تھے۔ اور انھیں نے اپنے
اس ہونہار فرزند کو ابتدائی تعلیم سے فیضیاب
کیا۔ جن کی شاگردی میں رہ کر پہلے ابتدائی
تعلیم حاصل کی اور قرآن پاک ناظرہ پڑھ چکنے کے بعد اس ابتدائی تعلیم کا
دوسرا دور شروع ہوا یعنی اوس کے بعد علم القرآن وعلم الحدیث اور فقہ
فلسفہ علم منقول ومعقول کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کیا اور خلافِ
قیاس بہت ہی کم عرصہ میں تمام علوم دینیہ و ابتدائی چیزوں پر خاطرخواہ
کامیابی حاصل کی۔ جسے آپکے والد بزرگوار نے بھی جو ان علوم کے باریک اور
زرین نکات مولانا آزاد کو سمجھانے والے خود ہی معلم تھے اپنے ہونہار
فرزند کی اس شاندار کامیابی اور پہلا ہی مرحلہ اس خوبی سے طے کر لینے
پر انتہا سے زیادہ مسرور و شاداں ہوئے۔

چونکہ بچے کی ابتدائی تعلیم وتربیت ہی اوسکی آئندہ زندگی کے اچھا

یا برا ہونے کی ذمہ دار ہوتی ہے اور اسی زمانہ کی تعلیم آیندہ تمام تر علوم
واخلاق اور تمدن کا سنگ بنیاد مانی جاتی ہے۔ لہٰذا مولانا آزاد کی قابل قدر
اور قابل رشک علمی قابلیت، ذہنیت اور بلند پایہ اخلاق و تمدن اس
امر کے بین ثبوت ہیں کہ آپ کے والد بزرگوار کی ابتدائی تعلیمی خیال اور قیاس
سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

آپ کے والد بزرگوار نے صرف اپنے اس دلبند جگر پارہ ہی کو
اپنے فیض جاریہ سے فیضیاب نہیں کیا بلکہ شب و روز عربی و عجمی نونہال
آپ [illegible] میں تعلیم حاصل کرتے تھے جو اعلیٰ پایہ کی درس گاہ
[illegible] تعلیم کا بہت بڑا مرکز مشہور تھی یہ درس گاہ کوئی
باقاعدہ [illegible] کالج، یا سکول کی طرز پر علیحدہ قائم نہ تھی بلکہ
یہ محض آپ کے رہائشی مکان ہی کو حاصل تھا۔ جس میں آپ نے
درس و تدریس کا سلسلہ قائم کیا ہوا تھا۔

جب آپ کے والد بزرگوار نے دیکھا کہ احمد (ابوالکلام آزاد) ابتدائی
تعلیم بخوبی حاصل کر کے اس قابل ہو گیا ہے کہ اسے کسی باقاعدہ
درس گاہ میں داخل کیا جائے تو آپ نے انھیں قاہرہ کی مشہور و مستند
عالم یونیورسٹی الازہر میں داخل کر دیا۔

چونکہ قدرت کو اس نادر روزگار بچہ سے چھوٹی عمر میں ہی بڑے
بڑے کام لینے تھے اس لیے دماغ اتنا ذکی و ذہین عطا کیا کہ ۱۴ سال
کی عمر میں ہی علوم مشرقی کا تمام نصاب پورا کر لیا اور ایک جید عالم بن کر

۱۴ سال ہی کی عمر میں دنیا کے سامنے آ گئے۔ یہی نہیں کہ حصول تعلیم کے بعد ایک فارغ التحصیل طالب علم ہی مانے گئے بلکہ خداداد قابلیت و ذہانت کی بنا پر حاصل کردہ تعلیم پر اس طرح عبور حاصل کیا تھا اور اتنی استعداد پیدا کر لی کہ اسی جامعہ ازہر میں جس میں آپ چند روز پہلے ایک ابتدائی طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے آپ کو مختلف مضامین پڑھانے پر معلم کے درجہ پر مامور کر دیا گیا۔

اس چھوٹی سی عمر میں علمی تبحر کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کے کہنہ مشق اور پرانے استاد بھی آپ کی علمی ذہانت و ذکاوت اور تیز فہمی پر حیران رہ جاتے تھے اور لوگوں کا ذہن خود بخود منظور کرتا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جو ہر اوس ذمہ داری سے سرخرو اور عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو اعلیٰ پایہ کا عزم و استقلال اور دیانت عقل و تدبر کی رہین منت ہو۔

انقلاب ذہنی

یہ تو ظاہر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا خاندان اور آپ کے خاندان کی روایات مذہبی قدامت پسندی میں ضرب المثل اور شہرہ آفاق تھیں، اور اس قدامت پسندی پر اعتقاداً اس سختی کے ساتھ عمل تھا کہ کسی ایک معمولی سے معمولی مسئلہ میں بھی خواہ وہ شرعی احکام کے تحت قائم چلا آتا ہے۔ خواہ رواج کے طور پر برتا جاتا ہے ایک سنت کے لئے بھی اوس میں ترمیم و تنسیخ کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔

مگر یہ تو فطرت ہی آزاد لے کر آئے تھے پھر بھلا رواج کے تحت مستعمل قوانین کی پابندی کیونکر گوارا کرتے؟ لہٰذا آپ نے اوس پرانے رویہ کے

ندا ایسے نکات پر جن کی رسم و رواج کے تحت صورت مسخ ہو چکی تھی اور دامت
رستی کا بھوت اسی دھڑے پر اندھا دھند چلنے اور یا عقل کی کسوٹی اور شریعت حقہ
کی میزان پر جانچے اندھی تقلید پر مجبور کر رہا تھا اپنے حق پسند مخبر کی آواز کو
قربانی کرنا گوارا نہ کیا اور حساس و حقیقت شناس طبیعت کے تقاضہ پر زندگی
کے ہر پہلو کا نئے سرے سے جائزہ اور امتحان لینا شروع کر دیا۔ اور اس
جانچ پڑتال اور تحقیق و تدقیق میں اپنے ایمان کی روشنی اور قرآن و حدیث
کے ٹھوس احکام سے امداد لیتے رہے۔ چنانچہ اب آپ کی زندگی کا وہ
حصہ جو زمانہ شباب کہلاتا ہے اس جستجوئے حق میں شروع ہوا۔

اس انقلاب ذہنی کی پہلی جھلک آپ کی خود نوشتہ سوانح عمری
"تذکرہ" میں ملتی ہے۔ یہ کتاب بھی دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے حقیقت
میں مصنف نے کوزہ میں دریا کو بند کر دیا ہے "تذکرہ" ذہن میں رفتہ رفتہ
کافی مواد اکٹھا ہو جانے کے بعد اس وقت وجود میں آئی جبکہ آپ ۱۹۱۹ء
میں اخبار ہی کالموں کے ذریعہ آزاد خیالی کے اظہار پر ۳۰ برس کی عمر میں بمقام
رانچی نظر بند کئے گئے۔ اور اس نظر بندی کے دوران ہی میں "تذکرہ"
کا وجود عمل میں آیا۔ انشاء اللہ اس نظر بندی اور اس سے رہائی کا خلاصہ
اپنے موقعہ پر آگے آئے گا۔

آپ کے بے بہا اور زرین خیالات کا پورا اندازہ تو "تذکرہ" کے
مطالعہ سے ہی لگایا جا سکتا ہے مگر ذیل کا ایک ٹکڑہ بھی آپ کے خیالات
کی کافی ترجمانی کر رہا ہے۔ آپ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :-

"میرے لئے ناممکن ہے کہ میں کسی بات پر
یقین لے آؤں جب تک میں اوسے اپنی
عقل کی کسوٹی پر نئے سرے سے پرکھ
نہ لوں"

مذکورہ بالا فقرہ میں مذہبی یا سیاسی، یا زندگی کے دیگر شعبہ جات میں سے کسی ایک شعبہ کی کوئی تخصیص ظاہر نہیں ہوتی ہے بلکہ ظاہر ہے کہ زندگی سے متعلقہ ہر شعبہ و ہر ادارہ کی طرف اس کا اطلاق ہے [illegible] آپ کافی عرصہ تک ایک متجسانہ حیثیت سے اس [illegible] مگر چونکہ ورثہ میں نورِ ہدایت پانے کے علاوہ [illegible] چڑھایا ہوا تھا اس لئے کچھ ہی عرصہ بعد اسلامی کتب اور [illegible] تعلیم کے گہرے مطالعہ سے اسلامی تعلیم کی بنیادی حقیقت اور اوسکی بے لاگ و بے پردہ صداقت آپ پر روشن ہوگئی اور پھر ایسی روشن ہوئی کہ اوسکی روشنی میں خود ہی راہ ہدایت پر گامزن نہ ہوئے۔ بلکہ اپنے مذہبی اور اسلامی بھائیوں، حتیٰ کہ ہمسایہ قوموں کو بھی اوس روشنی سے بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ دیا، جس کا ثبوت مولانا کا موجودہ رویہ اور شغل ہے، جس کی تشریح یہ ہے کہ مسلمان آزاد پیدا کیا گیا ہے اوسکی فطرت اوس کا مذہب اوسکی معاشرت اور اوس کا تمدن غرض سب کچھ آزادی کے سنگ بنیاد پر قائم ہیں۔ اور اسی آزادی کے علمبردار ہونے کا فخر آج مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اسی طرح حاصل ہے جس طرح موجودہ وقت کی چند اور دیگر مقتدر و متبرک

ہستیوں کو بلکہ بعض وجوہ کی بناء پر اور خاص خاص صورت حالات میں آپ دوسروں سے بڑھے ہوئے بھی ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مولانا آزاد نے اپنے خاندانی احترام و تقدیس کو اپنے آباؤ اجداد کی طرح برقرار رکھا ہے۔ اور آپ کی دلی آرزو بھی یہی ہے کہ زندگی کے آخری سانس تک بزرگان سلف اور بلند پایہ و ثناء کے طریق کار پر کاربند اور حق و صداقت پر پورے خلوص سے گامزن رہا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا عنفوان شباب

یہاں ضروری تھا کہ آپ کے زمانۂ شباب سے کچھ مفصل حالات اور تحصیل علم کے ضمنی واقعات بیان کئے جاتے جس سے اس کتاب کی شان صحیح معنوں میں اور بھی زیادہ وقیع ہو جاتی اور صرف شان ہی دو بالا نہ ہوتی بلکہ اس کمی سے جو زبردست خامی رہ گئی ہے وہ بھی بدرجۂ اتم پوری ہو جاتی۔ مگر افسوس باوجود کوشش کے بھی کوئی سواد ایسا مواد فراہم نہ ہوسکا کہ اس خلا کو پُر کیا جاتا۔

رہی مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نوشت کتاب "تذکرہ"، تو اس سے بھی یہ پیاس نہ بجھ سکی اور راقم الحروف اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ناچیز ہدیہ "تواریخ حیات مولانا آزاد" اس مقام پر تشنہ دہن ہی رہے۔

ہاں اگر "تذکرہ"، کا دوسرا حصہ عدم اشاعت کی دلدل میں پھنس کر نہ رہ جاتا تو ممکن تھا کہ اس اظہار افسوس کا موقعہ نہ آتا۔

ایک موقعہ پر مولانا ابوالکلام ارشاد فرماتے ہیں کہ انھوں نے سلر بستان

زندگی میں اُن اعلیٰ مقاصد کو اپنا مطمح نظر بنالیا تھا جن کی تحصیل انسان کے
دل میں سیماب کی سی بیتابی پیدا کر دیتی ہے۔ اور جن کو حاصل کرنے کے لیے
انسان سراپا آرزو ہو کر ہمیشہ کوشش کرتا رہتا ہے۔
مولانا ابوالکلام آزاد کے جو کچھ بھی واقعات و حالات اور اون سے
واقفیت بہم پہونچ سکی ہے اوس سے اندازہ لگاتے ہوئے اور پھر موجودہ
دور میں آپ کی قومی مخلصانہ سچی خدمت جو آج ہمارے سامنے ہے اوس سے
امداد لیتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ کے مذکورہ بالا ارشاد کا مطلب
جس میں آپ نے ایک خاص قسم کے اعلیٰ مقاصد کو اپنا مطمح نظر بنالیا تھا یہی
سوائے قومی درد کے اور اوس درد سے متاثر ہو کر ڈوبتی ہوئی قوم کو
ابھار کر ساحل مقصود تک لے آئیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ بعد کے
بے شمار واقعات اور کارگزاریاں اور اک خاص طرز پر اپنی زندگی کو قوم کے
لئے وقف کر دینا یہ سب باتیں اس خیال کو یقین کے درجہ تک پہونچا رہی
ہیں۔ یقیناً آپ کی یہ آرزو صرف قوم کو سیاسی ادبار سے نکال کر
عروج کی بلندیوں تک لے جانا ہی تھی۔ مگر افسوس آپ کو اپنے اس
نظریہ سے شباب کی آخری منزل تک تو کافی جد و جہد کے بعد بھی کامیابی
نصیب نہ ہوئی۔ اور صبح جوانی میں دور افق کی گہرائیوں میں جو منزل مقصود
یا انتہائے سفر نظر آرہا تھا شام جوانی پر بھی اتنا ہی مسافت معلوم ہوتی
تھی اور اب امید کی کوئی شمع بھی ایسی نہ تھی جس کی امداد سے یہ تاریک راہ
دوسری صبح سے قبل طے ہو جاتی۔

غرض جب آپ کی زندگی کا وہ حصہ جو بچپن اور لڑکپن کا زمانہ کہلاتا ہے بسلسلۂ حصول تعلیم مجاز مصر میں گزر چکا تو شباب کے پہلے زینہ میں قدم رکھا اور یہیں سے آپ کو وہ احساس پیدا ہوا جس کا ذکر آپ کے خود کے مقولہ سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد بتدریج زمانہ شباب کے مدارج یا بام شباب کی سیڑھیاں طے کرنے لگے حتیٰ کہ اس زینہ کا درمیانی حصہ اور پھر آخری حد بھی آگئی۔ یعنی اب آپ عنفوان شباب کا سارا زمانہ امیدوں کے گھوڑے دوڑاتے حسرتوں کو بار آور ہونے کے خواب دیکھتے اور قوم کے ادبار و عروج پر بے شمار خیالی قلعے تعمیر و مسمار کرتے تیس سال کی عمر میں پہونچے جسے پیری کا دروازہ کہنا چاہیئے۔ (جبکہ آپ مقام رانچی میں قومی خدمت بذریعہ اخبارات انجام دینے کے سلسلہ میں نظر بند کیئے گئے لہذا مضمون کا تسلسل کے تحت آگے چل کر یہ واقعہ بھی اپنی جگہ بیان کیا جائے گا)

ہاں تو یہ زمانہ یعنی زمانۂ شباب آپ کا در مقصود نہ پانے کی کلفتوں کی بنا پر انتہائی کرب و بے چینی سے گزرا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں آپ نے قومی فلاح و بہبودی کے لئے جان پہیم توڑ کوششیں اور بڑی بڑی قربانیاں دے کر اپنی بے پرواہ اور ڈوبتی ہوئی قوم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ اور آخر کار قوم نے سمجھ لیا کہ حقیقتاً ہمارے سیاسی بیڑہ کو ساحل مقصود پر کامیابی سے لگا دینے والا ہوشیار اور درد مند ملاح یہی ہے جو خطرناک اور تباہ کن موجوں میں اپنی جان کی پرواہ نہ کرتا ہوا

برابر ہاتھ پیر مارتا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ انھیں کوششوں اور قربانیوں کا کچھ خلاصہ جو آپ نے بیس سال کی عمر تک قوم کے سامنے پیش کیں ذکر کیا جاتا ہے۔

آپ کے شباب کی تفصیلات

جب آپ قوم کے اوبار عروج کے سلسلہ میں بے شمار خیالی کشمکش کر چکے اور کامیابی کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی تو حسرتناک نگاہیں قدرت کے فیاض دست کرم کی طرف متوجہ ہوئیں جس کے نتیجہ میں آپ نے معلوم کر لیا کہ دل کبھی نہ ختم ہونے والی خواہشوں اور تمناؤں کا خزانہ ہے۔ اس کے بعد مشیت الٰہی اس طرح پوری ہوئی کہ مولانا آزاد کا ہاتھ توفیق الٰہی سے ناگہاں پکڑا اور عشق و محبت کی شاہراہ پر لا چھوڑا۔

اس مقام کو اول اول تو ہر انسان کی طرح آپ نے بھی حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھنے کے ولولے دل میں پیدا ہونے اور اس کے جب ذرا حیرت کم اور ولولوں میں استحکام و زیادتی ہوئی تو آپ نے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہہ کر اس منزل عشق و حقیقت میں قدم رکھ ہی دیا۔

راستہ کی نہ برداشت نہ ہونے والی تکالیف کو سر پر لیتے اور گوناگوں رکاوٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے اس عشق و حقیقت کی اس آخری منزل سے پہونچے۔ جہاں متاع دمداد جنس جان سپاری کے علاوہ کسی اور شے کو مقبولیت نہیں ہو سکتی۔

کچھ ایام گذشتہ اور اس منزل تک پہونچتے ہی جو بادیہ پیمائی کرنی پڑی

اوس سے حاصل شدہ تجربات سے مدد ملی۔ اور پھر تائید ایزدی نے حوصلہ بڑھایا جن کی وجہ سے مولانا آزاد اوس مقصد عالی تک پہونچ گئے جس کی کاربراری کے لئے کارساز حقیقی نے آپ کو خلق کیا تھا۔

عشق و محبت کے میدان میں یہ گام فرسائی جو وقت اپنی منزل تک رسائی حاصل کر رہی تھی یہ وہ وقت جبکہ آپ تحصیل علم سے مکمل طور پر فراغت حاصل کر کے جامع ازہر مصر سے ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔

ہندوستان آکر آپ نے ایک ساحلی مشہور کلکتہ شہر میں اقامت اختیار کی۔ اور اپنے دردمندوں کے خون سے اس شجر کو ہمدردی قوم کو سینچنا شروع کیا جو انھیں اپنے خاندان کے متعدد بزرگوں سے ورثہ میں پہونچا تھا۔ اور جسے آپ جامع ازہر میں برابر پرورش کرتے رہتے تھے۔

ادبی لائن میں پہلا اور شاندار قدم

یہ تو معلوم ہو چکا کہ آپ نے ۱۴ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر ایک امتیازی درجہ عالمانہ حاصل کر لیا تھا۔ لہذا علم دوست طبیعت ہونے کی وجہ سے بہت جلد ادبی افق پر نمایاں ہو گئے۔ یعنی ۱۵ سال کی عمر سے آپ کی ادبی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے آپ نے ایک ماہوار جریدہ "لسان الصدق" کے نام سے جاری کیا۔ جس میں ادبی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی جواہر پارے اس دریا دلی سے بکھیرنے اور لٹانے شروع کئے کہ مولانا الطاف حسین صاحب

حالی رحمۃ اللہ علیہ جیسی برگزیدہ اور ممتاز ہستی سے جنہیں آسمان علم کا روشن ستارا کہنا بھی ناکافی ہے اور جن کی علمیت و قابلیت کا ڈنکہ اس وقت دور دور بج رہا تھا داد لیے بغیر نہ رہے۔

مولانا حالی صاحب مولانا آزاد سے ۱۹۰۴ء میں ملاقی

مولانا آزاد مولانا حالی کی نظر میں

ہوئے۔ تو مولانا حالی صاحب کو یہ یقین ہی نہیں ہوا کہ ۱۶ سال کا لڑکا "لسان الصدق" جیسے بلند پایہ اور فصیح و بلیغ اخبار کا ایڈیٹر ہو سکتا ہے لیکن جب دو بدو گفتگو اور تبادلۂ خیالات کا موقع آیا تو مولانا آزاد کی برق صفت تقریر اور معانی خیز بیان اور عالمانہ طرز گفتگو نے مولانا حالی کو ماننا پڑا کہ یہ گراں بہا موتی اور قیمتی جواہر ریزے جو الفاظ کی شکل میں "لسان الصدق" کے صفحات پر میں دیکھتا رہا ہوں یقیناً اسی مجلا دماغ کی پیداوار ہیں۔

یہ یقین ہو جانے کے باوجود مولانا حالی علمی اور عمری کمال بزرگی کے باوجود مولانا آزاد کے کمالِ علمی کے عمر بھر مداح و معترف ہی نہیں رہے بلکہ ہمیشہ اپنے ہمپایہ قدر و منزلت اور وقار و منزلت کا مستحق سمجھتے رہے۔

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی

مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی کی نظر میں

بلند شخصیت اور بزرگانہ علمیت سے کون واقف نہیں۔ آپ کا زمانہ اور مولانا حالی کا

کا زمانہ ایک تھا۔

گویا اسوقت افق علم سے یہی دو درخشندہ ستارے اپنی ضو سے اوس تاریکی کو پاک کر رہے تھے جو سیاست اسلامی پر غلاف در غلاف کی شکل میں چھائی ہوئی تھی۔ کہ خوش قسمتی سے تیسرا روشن ستارا اور طلوع ہو گیا یعنی مولانا آزاد۔ چنانچہ مولانا آزاد کے وجود مسعود کو یہ ہر دو بزرگ غنیمت سمجھتے رہے اور خوش تھے کہ ہمارا ہاتھ بٹانے والا قدرت نے ایک اور بھیج دیا۔

مولانا آزاد نے ۱۴ سال کی عمر میں ہی مولانا شبلی سے خط و کتابت شروع کر دی تھی اور کہنہ تجربہ کاری و علمی پختہ کاری سے اقتباس علم و تصوف کر رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ "لسان الصدق" جیسے ٹھوس اور بلند معیار پرچہ کی ایڈیٹری انجام دیتے ہوئے اپنے انتہائی مصروف وقت کا کچھ حصہ نکال کر لاہور کے مشہور رسالہ "مخزن" کے لئے مضامین بھی لکھ کر بھیجتے رہے

مولانا شبلی اور مولانا آزاد کا ایک لطیفہ

قاعدہ ہے کہ جب تک دو اشخاص صرف خط و کتابت ہی کے ذریعہ تبادلہ خیالات کرتے رہیں اور بالمواجہ گفتگو کا موقعہ نہ پیدا ہو اوسوقت تک تحریر ہی سے کاتب کے اخلاق، خیالات اور علمی وسعت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں تصویر کاتب کی ایک فرضی تصویر بھی خواہ مخواہ قائم ہو جاتی ہے جس کی عمر، خد و خال، اور قد و قامت سب کچھ صرف تصور ہی کی ترجمانی پر مقرر ہو کر ذہن میں ایک خاکہ قائم ہو جاتا ہے۔

اور وہ اوس وقت تک زائل نہیں ہوتا جب تک کہ کاتب مجسم روبرو نہ آجائے
چنانچہ یہی صورت یہاں بھی قائم تھی۔

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا آزاد کو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا صرف
خط وکتابت جاری تھی۔ لہٰذا مولانا آزاد کی فضل وکمال سے بھری ہوئی
ٹھوس تحریر اور بزرگانہ وعالمانہ خیالات اور پختہ کاری کی جھلک لئے ہوئے
انداز بیان نے مولانا شبلی کے ذہن میں مولانا آزاد کی جو تصویر یا خاکہ قائم
کیا وہ ایک بزرگانہ اور معمرانہ تھا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ مولانا آزاد کوئی معمر
بزرگ ہیں جو کہنہ مشقی اور تجربہ کاری میں ضرب المثل ہیں۔

مگر جب مولانا آزاد مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے بمبئی میں ۱۹۰۴ء
میں بمبئی میں ملے تو یہ لطیفہ ظہور میں آیا۔

مولانا شبلی سمجھے کہ یہ مولانا آزاد صاحبزادے ہیں اس لئے فرمایا کہ
"آپ کے والد بزرگوار مولانا آزاد کے علم وفضل اور کمال کے کیا کہنے ہیں،
میں اپنے پاس وہ الفاظ نہیں پاتا جس سے اونکی تعریف کر سکوں، واقعی
قابل احترام بزرگ ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

مگر جب مولانا شبلی کو بتایا گیا کہ مولانا آزاد یہ خود ہی ہیں جو آپ کے
سامنے ۱۵ سال کی عمر میں کھڑے ہیں تو آپ کے تعجب وحیرت کی انتہا نہ
رہی اور ساتھ ہی خوشی ومسرت کا دریا لہریں لینے لگا اور خدا کا شکر ادا کیا
کہ وہ ایسی ایسی نادر الوجود ہستیاں پیدا کرتا ہے جنکے طفل کا زمانے بھی ایسے
ہوتے ہیں کہ لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں ملک وقوم کے بے شمار قدردان اصحاب آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور جدھر نکل جاتے۔ آپ کے معترف آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اور حقیقت میں جس عزت کے مستحق تھے اوس سے زیادہ کی جاتی۔
یوں تو آپ کی علمی قابلیت کا معترف ایک زمانہ تھا مگر صحیح معنوں میں اعتراف علم دوست اصحاب ہی کرسکتے تھے۔ چنانچہ منجملہ بہت سے ایسے اصحاب کے ایک نواب محسن الملک بھی تھے جو مولانا نانے آزاد کو ہمیشہ "خورد سال مگر علم میں پختہ کار" کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست
انیسویں صدی کی ابتدا میں

یہ زمانہ انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا اوس وقت کے مسلمانوں کی سیاست کا نقشہ عجیب مایوس کن تھا۔
سرسید احمد صاحب اور ان کے ہمخیال بزرگوں کی ان تھک کوششوں سے علی گڑھ کالج وجود میں آچکا تھا اور اس چہار دیواری سے مسلمانان ہند کے بچے اعلیٰ پیمانہ تک انگریزی تعلیم حاصل کرکے نکلتے تھے اور اس کالج کے قیام کا اصلی منشا یعنی انگریزی دفاتر میں اعلیٰ ملازمتیں حاصل کرتے تھے۔
انصافاً کہنا پڑتا ہے کہ آج جو انگریزی حکومت کے ہر چھوٹے سے چھوٹے ادارہ سے لے کر بڑے سے بڑے محکمہ تک بلند پایہ اور ذمہ دار ملازمتیں

اور وزارتیں تک جیسے اعلیٰ مراتب مسلمانوں کو حاصل ہیں چھوٹی بڑی ریاستوں کے وزیر اعظم اور بڑے بڑے وکلا و بیرسٹر غرضیکہ دنیوی وجاہت و اقتدار کا صحیح معیار جو مسلمانوں کو میسر ہے یہ سب کچھ مولانا سر سید احمد یا علیگڈھ کالج ہی کا صدقہ ہے۔ ورنہ اگر مسلمان آج بھی ابھی خام خیالی اور غلط اعتقادی میں پڑے رہتے تو یقیناً بہت جلد یہ ایسی پستی میں جا گرتے جس سے نکلنا شاید نا ممکن ہو جاتا۔

آفرین اور ہزار آفرین ہے سر سید احمد کی ہستی کو جس نے ایسے نازک اور مخالف وقت میں اس کالج کی بنیاد قائم کی جبکہ مسلمان انگریزی تعلیم کو حاصل کر کے کفر کے درجہ تک سمجھتے تھے۔ گویا اوس وقت کے مسلمانوں کے نزدیک ایک مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کر کے مسلمان ہی نہیں رہتا تھا۔ مگر اب فخر کے ساتھ کہنا پڑتا ہے اور اعتراف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اوسی چہار دیواری سے جس کے اندر داخل ہونا اون کے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مصداق آج ایسے ایسے ہونہار اور قابل قدر حضرات پتھر سے پارس بن کر نکلتے ہیں جنھیں بے بہا موتی کہیں تو بجا ہے۔ محمد علی مرحوم جو ہندوستان کے مایہ ناز اور ہر ہندو ملت کے نزدیک قابل ستایش بزرگ ہستی، علامہ ڈاکٹر سر اقبال، مسیح الملک حکیم اجمل خاں۔ شیر پنجاب ظفر علی خاں، وغیرہ وغیرہ سب علی گڈھ کالج ہی کے صدقات ہیں۔

چنانچہ بہت جلد اس کالج کے قابل تحسین نتایج نے مسلمانوں میں

اپنی غلطی پر نادم اور شرمسار ہونے کا احساس پیدا کر دیا۔ اور اب سر سید مرحوم کی روح کو خراج عقیدت پیش کئے جانے لگے۔ اور اس کالج کی قدر و منزلت اس قدر بڑھتی ہوئی بام عروج کو پہونچی کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد بمشکل ہی کوئی مخالف نظر آتا تھا۔ ہاں غیر تعلیم یافتہ طبقہ اب بھی پہلے ہی کی طرح مخالف تھا۔ حتی کہ وہ وقت آگیا کہ اس زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمان مذہب کے ہر ارکان اور سیاسیات کی ہر کڑی میں صرف ارباب علیگڈھ ہی کو اپنا قطعی رہنما سمجھنے لگے۔ اور اس طرح اوسی علی گڈھ کالج کو جو کل تک ان کے نزدیک کفرگاہ تھا اتنی وقعت حاصل ہوگئی کہ آج مسلمانوں کی نمایندگی اور ان کی مذہبی و سیاسی آراء کا واحد مرکز مانا جانے لگا۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام اور اوسکا مقصد اولین

علی گڈھ کالج کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہو کر مسلمانوں میں بھی ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ وہ خیال گو سیاست کا حصہ کہا جا سکتا ہے مگر وہ محض وہ صرف سیاست خاص کہلانے کا مستحق تھا جس سے صرف تعلیم یافتہ اور سرمایہ دار طبقہ کے افراد مستفیض ہو سکتے تھے۔ ورنہ عام لوگوں کو حتیٰ کہ غریب اور ادنیٰ درجہ کے مسلمانوں کو بھی اوس خیال سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا۔ وہ خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو قانوناً برابر کی ملازمتیں حاصل کرنے کا موثر ذریعہ بنانا چاہیئے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیئے لازمی تھا کہ ایک طرف گورنمنٹ سے دوستانہ اور ہمدردانہ رشتہ قائم

کیا جائے اور دوسری طرف خاص طور سے مسلمانوں کے لئے روپیہ اور توجہ
کی امداد حاصل کی جائے تا کہ وہ مدرسوں اور کالجوں میں اعلیٰ تعلیم پا سکیں۔
اب اس مقصد براری کے لئے کوئی قومی ادارہ بھی قائم کیا جانا ضروری
تھا جس کے تحت اس اسکیم کو دونیز دوسری جو اسکیمیں بوقت ضرورت قائم
کی جایا کریں باقاعدہ عملی جامہ پہنایا جایا کرے۔ اور اوس ادارہ کو عام
مسلمانوں کا نمایندہ ہونے کا فخر حاصل ہو۔ لہٰذا سنہ ۱۹۰۶ء میں اسی خیال کے
تحت جو اوسوقت کے حالات و مصالحات کو دیکھتے ہوئے بالکل درست
تھا ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام مسلم لیگ رکھا گیا گو مذکورہ بالا فوائد حاصل
کرنے کی اغراض کی بنا پر اس ادارہ کو سیاست سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا
مگر مشہور یہی ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی خیالات کی نمایندگی کے لئے
مسلم لیگ قائم کی گئی ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کا قیام ظہور میں آیا اور اوس
کے مقاصد کے متعلق مسلم لیگ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ مسلم لیگ کا
مقصد اولین تاج برطانیہ کے ساتھ عام مسلمانوں سے جذبہ وفاداری کا
پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے جواب میں برطانوی حکام نے بھی مسلم لیگ کے
ارکان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنے رویہ سے یہ ظاہر کر دیا کہ بلا شک
مسلم لیگ سرکاری حکمت عملی کی آلہ کار رہے۔
مسلم لیگ اور اوس کے سرپرست سرکردہ لیڈروں کی یہ پالیسی گو وقت
کا مقتضا کا تقاضہ ضرور تھا جیسا کہ مولانا محمد علی مرحوم جو ایک معنی میں مسلم لیگ
کے واحد قائم کردہ بزرگ تھے اور آج جن کے نام نامی سے ہندوستان کا

ہر فرد خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلقات رکھتا ہو اور ہندوستان کے کسی بھی گوشہ میں آباد ہو کما حقہٗ واقف ہے۔ اپنے خیالات پاکیزہ کے واحد ترجمان اخبار کامریڈ کی پہلی ہی اشاعت میں جو ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو ہوئی جسے کلکتہ سے آپ ہی اپنی سرپرستی میں نکالا کرتے تھے فرماتے ہیں :۔

"ہم کسی کی جانب دار نہیں ہیں اور سب کے ساتھی ہیں ہم مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے روز افزوں اختلافات کے خطرات کو بخوبی محسوس کرتے ہیں اور ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی نظام کے مختلف اجزاء میں بہتر تعلقات پیدا ہوں"

علاوہ ازیں حکومت اور رعایا کے باہمی تعلقات کی نسبت مولانا محمد علی صاحب کی یہ آرزو تھی کہ ان دونوں کے مابین جو مابہ الامتیاز خط حائل ہے وہ بالکل محو ہو جائے اور آپ کا منشا دلی یہ تھا کہ جہاں ایک طرف ہم اپنی قوم کے حقوق کی حفاظت کریں وہاں ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان رشتہ اتحاد و اتفاق کو ترقی دیں اور گورنمنٹ کے افعال پر نیک نیتی کے ساتھ نکتہ چینی کریں تا کہ راعی اور رعایا کے تمام امتیازات یکسر محو ہو جائیں۔ اور تمام ہندوستانی انگریزوں کی حکومت کو خود اپنی حکومت سمجھنے لگیں۔

مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی بے پایاں علمی استعداد اور ہر دم بے کل رکھنے والے قومی درد کی وجہ سے مسلم لیگ کے ہر امور میں سیاہ و سفید کے ہر طرح مالک اور مختار تصور کئے جاتے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ

کامریڈ کے کالموں میں محمد علی مرحوم کا مطمح نظر اس قسم کا تھا کہ گورنمنٹ سے دوستانہ اور ہمدردانہ جذبات ظاہر کرتے ہوئے اپنی ترقی کے دروازہ کھولے جائیں۔ اور اسی بناء پر کسی ایسی جماعت یا ادارہ میں شامل ہونا پسند نہ کرتے تھے جو ہندو مسلم سکھ اور عیسائی وغیرہ کل مذہب وملت کے افراد پر مشتمل ملکی جماعت کہلاتی ہے اور وہ براہ راست گورنمنٹ سے آزادانہ اپنے اون مطالب کی تکمیل چاہتی ہو جس کے معنی سلف گورنمنٹ کے نکلتے ہوں۔

چنانچہ اپنی قوم کی آواز صرف مذکورہ بالا خیالات پر علیحدہ مرکز سے بلند کرنی چاہی۔ اور اسپر عمل بھی ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اب ۱۹۱۴ء کا زمانہ آگیا۔

مسلمانوں کی سیاسی تبدیلی!

منجملہ اور کئی اسکیموں کے ایک اسکیم مسلم لیگ کے ارکان نے یہ بھی گورنمنٹ کے سامنے پیش کی ہوئی تھی کہ ہندوستان سے صوبہ بنگال کو علیحدہ کردیا جائے اور اس تقسیم سے مسلمانوں کو فائدہ حاصل کرنے کا موقعہ دیا جائے۔

مگر مسلم لیگ کے اور عوام مسلمانوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات میں تڑپا دینے والی بیتابی اور زبردست ہیجان شروع ہوگیا جبکہ گورنمنٹ کے مسلم لیگ کے اس نظریہ کے برخلاف تقسیم بنگالہ کو منسوخ کردیا۔ اب ارکین مسلم لیگ اور قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان

اس امر کو محسوس کرنیکے بعد اسپر غور کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور خواہ مخواہ دلوں میں رائے قائم ہونے لگی کہ جب ہماری وفاداری مسلمہ ہے تو اس کے برعکس دوسری اقوام کے مقابلہ میں گورنمنٹ ہمارے مفاد کو مدنظر رکھنا کیوں پسند نہیں کرتی ؟ اور جب یہ مشاہدہ بھی ہو چکا تو پھر کیوں نہ ہم سیاسی معاملات میں اپنے دیگر برادران وطن کی ہم نوائی کرنے لگیں۔ اب تک ہندوؤں سے علیحدگی اسی بناء پر تھی کہ اس طرح ہم اپنے خاص اغراض و مقاصد کو گورنمنٹ سے تسلیم کرالیا کرتے تھے۔ لیکن جب گورنمنٹ ہمارے مفاد کو مدنظر نہیں رکھ سکتی تو پھر کیوں علیحدہ رہا جائے۔ لہٰذا ہم کو بھی کانگریس کے مطالبات میں شریک ہو جانا چاہیئے اسوقت تک انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی میں چند ہی افراد مسلم قوم کے شامل ہو سکے تھے۔ مگر بدقسمتی کہیئے یا اور کچھ کہ ابھی مسلمانوں کے دماغوں میں یہ خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ کوئی حتمی فیصلہ نہ کر چکے تھے کہ آیا ہمیں کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیئے جو ایک ملکی جماعت اور کمل آزادی ہند اپنا نصب العین قرار دیئے ہوئے ہے۔ یا ابھی مسلم لیگ ہی کے ذریعہ اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کرتے رہیں۔ کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ بلقان چھڑ گئی۔ جو ترکوں کے لئے ایک تازہ مصیبت تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی توجہ فوری طور پر اس طرف مبذول ہو گئی اور ایک بے چینی و اضطراب پھیل گیا۔ اور مسلمانوں کے دل رنج و غم سے لبریز ہو گئے ہر طرف مایوسی اور تفکرات کی لہر دوڑ گئی اور مسلمانوں کے خیالات میں ہمیشہ ہیجان پیدا ہو گیا اور جو ہیجان جنگ بلقان کے ختم ہوتے تک برابر قائم رہا۔ اور ہندوستانی وہ مسلمان جو مسلم لیگ

سے وابستہ تھے یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ہمیں اپنی سیاست کو کامیاب دیکھنے کے لیے ابھی مسلم لیگ کا وجود قائم رکھنا چاہیے یا کانگریس کمیٹی میں جو ملکی ادارہ ہے شامل ہو جانا چاہیئے۔ اور اسی پریشانی اور اضطراب کی وجہ سے مسلم لیگ کے وہ مقاصد بھی تبدیل نہ ہو سکے جو گورنمنٹ سے وفاداری کا جذبہ قائم رکھنے سے متعلق تھے۔

جب جنگ بلقان چھڑ گئی تو ترکوں کے ساتھ مذہبی اور دینی لگاؤ ہونے کے سبب ہندوستان کی طرف سے بھی کافی امداد فراہم کی گئی۔ اور اسی جذبۂ اخوت سے متاثر ہو کر مولانا محمد علی مرحوم نے بھی کامریڈ میں ترکوں کی طبی مالی امداد دیگر ذرائع سے امداد پہونچانے کا سلسلہ اس سرگرمی سے شروع کیا کہ ہندوستانی مسلم لیگی مسلمان کچھ عرصہ کے لئے کانگریس اور لیگ میں امتیاز کرنے کے مسئلہ کو بھول گئے اور وہ معاملہ جوں کا توں ہی رہ گیا۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور ان کی سیاست کا نیا دور چلنے کا پہلا دروازہ کھلنے کے اسباب ضرور پیدا ہو گئے۔ یعنی مسلمانوں کو اب ضرورت محسوس ہونے لگی کہ انہیں بھی سیاست میں صحیح طور پر اور کسی دوسرے رنگ میں حصہ لینا چاہیئے۔

چنانچہ یہ زمانہ یعنی سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک کا درمیانی عرصہ مسلمانوں کی سیاسی بے چینی اور سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔

مولانا آزاد کا قوم سے ایک سوال

مولانا آزاد ایک عرصے مسلمانوں کی گرتی ہوئی

حالت کو دیکھ رہے تھے اور بے چین تھے کہ کس طرح اس حالت کو درست کیا جائے۔

چنانچہ اس مدت میں آپ ہر پہلو اور ہر صورت پر غور کرتے رہے کہ ہندوستان اور اس کی روز افزوں پریشانیاں ہمارے سامنے ہیں وہ اپنے مستقبل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ہم اس رفتار سے اگر اب بھی بے خبر رہے تو اتنے پیچھے رہ جائیں گے کہ پھر تیز رو مسافروں کا ساتھ لینا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیئے ضروری ہے کہ بہت جلد ہم اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں واقعات اور حالاتِ گزشتہ اور موجودہ کی تہہ تک پہونچکر یہ دیکھنا چاہیئے کہ آج ہم کس حالت میں ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس بحر تفکر میں غوطہ زن کر کے تمام معاملات کا نچوڑ نکالا اور صرف ایک سوال پر تمام الجھنوں کا جواب تجویز کر لیا۔ وہ یہ کہ یہ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟

لہٰذا اگر پہلی صورت ہے یعنی ہم ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں تو بلا شبہ ہماری راہ دوسری ہو جاتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستور اساسی کا تحفظ، ان میں سے ایک بھی چیز ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ اور اس صورت میں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنے حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے کسی تیسری طاقت کا وجود وہاں برداشت کریں چنانچہ

تیسری طاقت یعنی گورنمنٹ برطانیہ موجود ہی ہے جو خود بھی جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور اپنے شک اور خوف و بے اعتمادی کی وجہ سے ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہیئے کہ وہ ہندوستان سے نہ جائے اور اس طرح بلکہ دائمی غلامی سے قدم جما کر حکومت کئے جائے۔

اور اگر ہم اپنی قوت ایمانی اور قوت ارادی پر جو بمقابلہ دوسروں کے بفضلہ تعالیٰ مسلمانوں کو زیادہ قوی صورت میں حاصل ہیں اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمیں دوسری اقوام سے ڈرنے اور خوف کھانے یا کسی قسم کا شک کرنے کی کوئی وجہ اور کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ایک مسلمان کا حق کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں چھین سکتی اور ہمیں ہمت بلند حوصلگی، اور خود اعتمادی کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیئے۔ اور سمجھ لینا چاہیئے کہ جب تک ہم زندہ کہلانے کے مستحق ہیں اس وقت تک ہمارا حق ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ چنانچہ اگر اس سوال کا یہ جواب ہے تو پھر ہمارے واسطے عمل کی راہ بالکل صاف اور واضح ہو جاتی ہے اور پھر ہم اپنے آپ کو ایک دوسرے ہی عالم میں پاتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی، اور انتظار کی درماندگیاں سب فنا ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی بجائے اس عالم میں یقین، اطمینان، مبارک ترین جدوجہد میں مصروفیت اور پھر بہت جلد ہی کامیابی جیسے تحفے نظر آتے ہیں۔ یقین، استقلال، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی غروب ہونا جانتا ہی نہیں۔ وقت کی کوئی پیچیدگی، حالات کی کوئی رفتار، معاملوں کی کوئی کشمکش ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔ بس اگر یہ جواب ہے تو پھر

ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں

چونکہ آپ ایک اعلیٰ ترین مدبر اور سیاسی گتھیوں کو احسن طریق پر سلجھانے والے روشن دماغ کے مالک ہیں اس لیئے زیادہ عرصہ نہیں لگا اور بہت جلد اس سوال کے ہر دو جواب معلوم کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔

آپ کے پُر خلوص دل کے ایک ایک ریشہ نے آپ کے بہادر اور غیور ضمیر کی ایک ایک آواز نے پہلے جواب سے انکار کیا جس کے نتیجہ میں دائمی غلامی اور نفس کی ابدی لعنتوں کا نشانہ بننا لازمی تھا۔

آپ نے خیال کیا کہ میں بذات خود اپنے لیئے اس جواب سے پیدا شدہ حالت کو ممکن ہے تصور کر بھی لوں مگر یہ ہرگز ہرگز ممکن نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی مسلمان بشرطیکہ اوس کے دل میں ایک رمق بھی ایمان کی موجود ہے اپنے لیئے اوس پہلی حالت کو دیکھنا برداشت کرے۔

بس یہی ایک چیز تھی یا یہی ایک نکتہ تھا جس کے حل ہو جانے کے بعد آپ نے اپنے لیئے راہ عمل یعنی اوس سوال کے دوسرے جواب پر گامزن ہونا مقرر کر لیا۔ جس کے بعد کی زندگی سیاسی زندگی کہلاتی ہے۔

اخبار الہلال
اور اس کی ضرورت

دراصل مولانا آزاد کی سیاسی زندگی جیسا کہ ابھی ابھی اوپر بتا آئے ہیں اسیوقت

سے شروع ہوتی ہے جبکہ آپ نے اخبار "الہلال" ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے جاری کیا۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آپ ابھی تک کسی بھی سیاسی جماعت سے منسلک نہیں ہوئے تھے۔

مولانا موصوف کا یہ قدم یعنی اخبار الہلال کا اجراء قومی خدمات کا ایک ذریعہ تھا آپ نے اپنے دل کے ایک ایک کونہ سے وہ تڑپ، وہ درد، اور وہ احساس جو ایک عرصہ مدید سے آپ کو بے چین کئے ہوئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور الہلال کے کالموں میں انتہائی فیاضی سے بکھیرنے شروع کر دیئے اور جو سوال آپ نے اپنے ضمیر سے کیا تھا وہی مسلمانوں کے سامنے رکھ کر جواب پانے کے منتظر رہے کہ دیکھیئے میری قوم کب میرے ان جگر پاروں کی قدر کرتی ہے تا کہ اوس کی ڈوبتی ہوئی ناؤ ذرا ابھرے اور پھر کسی کی امداد اور سہارے کے بغیر خود بھی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ساحل مقصود پر لا لگائے۔

چنانچہ آپ کا یہ ایثار بے سود اور غیر مفید نہ رہا۔ بلکہ ملک نے اس سے اثر لیا۔ اور وہ اثر لیا جس کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک عام کھلبلی سی مچ گئی کہ ہم سیاسی میدان کے کس حصہ سے گزر رہے ہیں اور اسوقت ہمیں کس جگہ اور کس مقام پر ہونا چاہیئے تھا۔ اور اس سست رفتاری کے کیا اسباب ہیں۔ اور اون کا کیا علاج ہے اور کیا ہماری اس حالت کا علاج صرف اوسی جواب پر منحصر ہے جو الہلال نے بتایا ہے؟

غرض یہ رنگت دن بدن بڑھتی ہی جارہی تھی اور مسلمانوں کی سیاست

ابھی کسی کروٹ پر قائم نہ ہو سکی تھی کہ یورپ کی خونریز اور جہاں سوز جنگ جسے جنگ عظیم کہا جاتا ہے کی ابتدا ہو گئی۔

چونکہ مسلمانان ہند کا ترکوں کے ساتھ اس سے پہلے جنگ بلقان سے تعارفِ برادرانہ ہو چکا تھا اور اس خوبصورتی سے کہ ہر دو طرف مذہبی اخوت کی بنا پر محبت، خلوص اور ہمدردی زیادہ سے زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ مسلمانان ہند اب انتہائی بیتابی سے اس کا انتظار کرنے لگے ہمارے بھائی وہ بھائی جو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ غیور اور بہادر بھی ہیں اِس جنگ میں شامل ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر شامل ہوتے ہیں تو اون کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔

اس جنگ کی پیدائش نے مسلمانان ہند کی پوزیشن بہت کچھ نازک کر دی وہ اپنی سیاسی جد و جہد کو تھوڑی دیر کے لئے بھول کر صرف اس انتظار میں تھے کہ ترکوں کا طرزِ عمل معلوم ہو جانے کے بعد ہم کچھ تصفیہ کر سکیں گے کہ اب ہماری پوزیشن کیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو ترکوں کے ساتھ مذہبی اخوت کے رشتہ کی بنا پر خلوص محبت اور ہمدردی کا جذبہ موجزن تھا۔ جس کی وجہ سے مسلمانان ہند ترکوں کے درد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے اور دوسری جانب حاکم وقت کی اطاعت اور اوسکی ذمہ داری کا بارِ گراں اونکے دوش پر تھا غرضیکہ یہ ایام مسلمانان ہند کے لئے سخت پریشانی اور تشویش کے ایام تھے اسوقت جو سب سے بڑی مصیبت تھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے ابھی تک سیاسی ترقی کے لئے کوئی خاص نصب العین مقرر نہیں کیا تھا حتیٰ کہ مسلم لیگ جو اوس وقت

مسلمانوں کو واحد نمایندہ ہونے کی دعویٰ دار تھی کچھ ایسے مبہم اور غیر معنی خیز
حلیوشن پاس کرتی رہی جس سے کوئی معلم نظر ایسا مکمل آزادی سے لگا کھا تا
ثر پیدا ہوتا تھا۔

علاوہ ازیں عام مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ علم سے بے بہرہ تھے اور
اسلام کا تعلق محض ایک نام نہاد قومی تعلق تصور کیا جاتا تھا اکثر تعلیم یافتہ
اان نوجوان جو علی گڈھ کی فضا سے مرتب منظم ہو کر نکلتے تھے مذہب
ہر رکن کی تحقیر کرتے اور مذہبی ارکان خصوصاً پنجوقتہ نماز۔ لازماً ماہ صیام
شب روزے، ڈاڑھی رکھنے ٹخنہ سے اونچے پاجامے یا تہہ بند پابعض
پابندی کے ساتھ ادائگی کی مخالفت ہی نہیں بلکہ اس مخالفت کو ملعت
الہانتے تھے۔

اگرچہ غیر انگریزی طبقہ یعنی وہ لوگ جو انگریزی تعلیم سے ناآشنا
بھی اسلامی معاشرت و اسلامی تعلیم سے بیگانہ نہ تھا۔ مگر مذہبی اعلام
کے ارکان کی پابندی صرف لاپرواہی اور کچھ دہریت آمیز خیالات
اشعار روات رہنمائی کے سبب اس سے بھی مفقود ہو چکی تھی۔ قرآن
کی حقیقت اور اسکی گہرائیوں سے لوگ غافل تھے۔

اب جب یہ حالت عام ہوتی گئی تو وقت اور حالات کے تقاضہ کی بناء پر
ایسی جانا چاہیئے کہ نتیجہ کے طور پر اس وقت علماء و مشائخ کا طبقہ بھی سلمانوں
ادبی حیات و ممات سے لاپرواہ ہو گیا تھا۔ اور ہمارے ان پیشواؤں کو
حالانکہ بھی ذمہ داری سے لئے ہوتے ہیں قوم کے اس برے طریقے تحت اثر کی

میں جو تپ چلے جانے کی خبر ہی نہ تھی سب سے زیادہ رونا اس بات
تھا کہ یہی گروہ علماء و مشائخ کبھی یہ کوشش بھی نہیں کرتا تھا کہ اس
زوال کے اسباب کی تحقیقات کی جائے۔

اخبار" کامریڈ" اور اخبار" الہلال"
کا
سیاسی موازنہ!

"کامریڈ" اخبار کامریڈ، جو مولانا محمد علی مرحوم کا تھا ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا اور اخبار "الہلال" کا جو ابوالکلام آزاد کا تھا اس کا ۱۹۱۲ء میں اجراء ہوا۔

وقت کے لحاظ سے گویا دونوں اخبار ایک ہی وقت میں جاری ہوئے مگر دونوں کی پالیسی میں رات اور دن کا فرق تھا۔

مولانا محمد علی نے "کامریڈ" کو جو رنگ دیا تھا وہ ایک فرقہ دارانہ حیثیت کا تھا اور گورنمنٹ کے نظریات کے مطابق۔

مولانا محمد علی صاحب "کامریڈ" کی ایڈیٹری خود فرماتے تھے جس کی وجہ سے اخبار کو چار چاند لگ گئے۔ نکلتے دیر ہوئی مگر مقبول ہو گیا۔ تیئیس ہوئی دریائے علم کے ایک زبردست پیراک یعنی مولانا محمد علی صاحب کی عالمانہ

اور فاضلانہ انگریزی انشا پردازی اور سے ہاتھوں ہاتھ لے اڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے بام عروج پر پہونچا دیا۔ ہندوستان کی اسلامی صحافت کی تاریخ میں اس شان کا کوئی پرچہ نہ نکلا تھا۔ اس کے فاضل ایڈیٹر مولانا محمد علی کی بے پناہ علمی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسوقت علاوہ کئی موقر اینگلو انڈین کے دو نامور پرچے ”بنگالی“ اور ”امرتا بازار پتریکا“ خاص ہندوستانیوں کے موجود تھے جو نہایت قابل اور کہنہ مشق ایڈیٹروں کی زیر ادارت شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ ان ہر دو اخبارات کے بالمقابل کسی جدید اخبار کا کلکتہ میں قدم جمانا بہت مشکل کام تھا۔ لہٰذا مولانا محمد علی صاحب کو اپنی اخبار نویسانہ حیثیت میں سب سے پہلے ان ہر دو پرچوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اپنی قوم کے خاص حقوق اور مقاصد کی حفاظت کرتے ہوئے مولانا موصوف کو ان ہر دو اخبارات کے ساتھ میدان صحافت میں بتر د آزمائی کرنی پڑی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ایک نوخیز اخبار نویس ہر طرح بنگالیوں کے بہترین دماغوں کی ہمسری کر سکتا ہے اور اسکو مسٹر سریندر ناتھ، بینرجی۔ اور مسٹر موتی لال گھوش جیسے کہن سال اور دیرینہ مشق اخبار نویسوں سے برابر کا مقابلہ کرنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے جب ان دو چوٹی کے بلند پرچوں سے بازی لے چکے تو پھر اینگلو انڈین پرچوں کے ساتھ بھی معرکۃ الآرا مقابلے کرنے پڑے۔ اور ان سب میں انھوں نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور طاقتور شخصیت کا سکہ جما دیا۔ بہت تھوڑے عرصہ میں ”کامریڈ“ کو موافق و مخالف ہر قسم کے حلقوں میں غیر معمولی شہرت

اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔

اِس کے مضامین جہاں ایک طرف پبلک بہ انتہائی دلچسپی سے پڑھتے جاتے تھے۔ ہاں دوسری جانب اعلیٰ حکام بھی اسکو نہایت غور اور شوق سے دیکھتے تھے۔ لارڈ ہارڈنگ، سر جیمس مسٹن، اور گورنمنٹ ہند کے دیگر ممتاز ارکین نے اکثر دفعہ،، کامریڈ،، کے مضامین کی مدح سرائی کی ہے۔ ان مضامین کی سب سے بہتر اور دلچسپ خصوصیت تو وہ انشا پردازی ہوتی تھی جو مولانا محمد علی صاحب کا خاص انداز ہے۔ اسی کے ساتھ دلائل کی قوت اور کبھی کبھی مذاق اور ہجو ملیح کی چاشنی اون کو بہت زور دار اور پر لطف بنا دیتی تھی۔

یہ تو اس اخبار کی مقبولیت و شہرت اور ہر دلعزیزی ہندیکی داستان تھی اب اس کی پالیسی ملاحظہ ہو کہ وہ کس قسم کی تھی اور اغراض و مقاصد کیا تھے۔

چونکہ یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ مولانا محمد علی صاحب مالک و ایڈیٹر ،، کامریڈ ،، مسلم لیگ کے کرتا دھرتا اور اک بااثر کارکن تھے وہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو اس پستی و ذلت سے نکال کر ترقی کے اوس بلند مقام پر پہنچا دو جس مقام پر وہ کر اس نے دنیا کی قوموں سے اپنا لوہا منوالیا اور اس کا طریقہ آپ نے یہ رکھا کہ حکومت وقت سے میل رکھتے ہوئے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت ،، کامریڈ ،، ہمیشہ کانگریس کی مذمت اور ہندو برادران کی مخالفت پر آمادہ رہتا تھا۔ اور کانگریس کے

نظریہ کا ایک ایک نکتہ پر وہ قائلانہ اور عالمانہ بحث سے کام لیا جاتا کہ دنیا حق عش عش کر کے رہ جاتی۔ یہ تو اخبار "کامریڈ" کی تاریخ اوسکی عظمت و شوکت کا عروج، اوسکی ہردلعزیزی کے درجہ تک پہونچی ہوئی مقبولیت و شہرت اور اوسکی سیاسی پالیسی یہ تھی جو بیان کی گئی۔ لہٰذا اس کی یہ شان مقبولیت ذہن میں محفوظ رکھ کر اب اخبار "الہلال" کے متعلق سنیئے:۔

"الہلال"

مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کو ملکی، اور قومی، زبان ہونے کا رنگ دیا۔ یہ فرقہ دارانہ رنگ سے مبرّا تھا۔ اور گورنمنٹ سے صاف اور صاف کھری کھری کہنے اور سننے والا۔ مگر صرف قوم کے لئے نہیں بلکہ ملک کے لیئے۔ اپنے ساتھ دوسرے ہم وطنوں کے لئے بھی اپنی سرتوڑ کوششوں سے حاصل کی جانے والی کامیابی میں حصہ رکھنا اس اخبار کا شیوہ رہا اور اسی قسم کی مخلوط سیاسی پالیسی پر آخر دم تک عمل پیرا رہا۔

مولانا محمد علی صاحب کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد بھی خود ہی "الہلال" کی اڈیٹری فرماتے تھے۔

چنانچہ جہاں تک انشا پردازی، اچھا نویسی، اور دلچسپ طرز بیان و تعداد اشاعت وغیرہ کا تعلق ہے "الہلال" "کامریڈ" سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ ہاں اگر اسے نیچا دیکھنا پڑا تو صرف ایک مقام پر یعنی اسے لارڈ ہارڈنگ، سر جیمس مسٹن اور گورنمنٹ ہند کے دیگر مقتدر اراکین کے ہاتھوں میں

پہونچنے کی اِتنے رسائی نصیب نہ ہوسکی۔ جس کی وجہ صاف ہے کہ اس کا رویّہ کا مریڈ،، جیسا نہ تھا جس کی وجہ سے گورنمنٹ اوسے اپنا اعتبار بنانے کو بھی تیار تھی۔ ورنہ اس کے علاوہ اورکسی صورت میں کم نہ رہا۔

اس اخبار کی شان مجتہدانہ تھی لکھائی چھپائی اور مضامین کی ندرت کی بدولت چند ہفتہ ہی میں مقبولیت وشہرت عام حاصل کرلی۔

الہلال،، کی بڑی خوبی اور شان سنجیدگی یہ تھی کہ کسی جنبدی بات میں کسی کی تقلید وحمایت یا کسی کی مخالفت نہ کی گئی بلکہ صرف مجموعی مفاد کو مدنظر رکھنا اور اصل مطلب پر اپنا زور بیان ختم کردینا اس کا اصل منشاء ومقصد تھا۔

علاوہ ازیں مذہبی دعوت تبلیغ، سیاسی پالیسی، علمی اور ادبی مضامین اور طرز تحریر میں ،، الہلال،، بالکل نرالی وصحیح اور نرالے ڈھنگ کا ثابت ہوا گو اسکی ہر بات میں روش ہی جداگانہ تھی۔ جو اپنی ندرت ومحبوبیت کا سکہ جمائے بغیر نہ رہتی ہے یہی وجہ تھی کہ عام طور پر لوگوں کو اسکی پالیسی پر عمل کرنا شروع کردیا۔ اور ملک میں اس کے ہم خیال کثرت سے بڑھنے لگے۔

،، الہلال،، کے قابل ایڈیٹر مولانا آزاد نے مسلمانوں کو قدیم تصورات میں اسوقت فوری انقلاب کی ضرورت محسوس کی جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے لہٰذا آپ نے ،، الہلال ،، کے ذریعہ یہ کام شروع کردیا۔ اور اپنے تخیل اندانداز دونوں میں جدت کا ثبوت دیا۔ اور پامال وفرسودہ راہوں سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی اور سیاسی مضامین کے ساتھ مذہبی مسائل پر پند ومواعظت کا سلسلہ شروع کردیا۔

بہت تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے پند و نصیحت نے مسلمانوں کے اُس تعلیم یافتہ طبقہ کو جو مذہبی ارکان کی تحقیر کرتا اور ان کے خلاف لڑنے کو فخر سمجھتا تھا اور جو پرانے و فرسودہ عقائد پرستی سے تنگ آگیا تھا۔ دوبارہ ایک نئے ولولۂ مذہبی سے سرشار کر دیا۔

"الہلال" نے دینی مباحث میں عقلی نکتہ چینی اور منطقی بحث کی طرح ڈالی اور علامہ ڈاکٹر اقبال کی طرح "الہلال" نے ہندوستان کے اُن مذہبی تحقیر کنندہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زندگی کے اہم و بنیادی مسائل پر غور و فکر کا عادی بنا دیا۔

"الہلال" ترقی پسند سیاسی تخیلات اور عقل پر پوری اترنے والی مذہبی ہدایات کا گہوارہ اور بلند پایہ و سنجیدہ ادب کا نمونہ تھا۔ جس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ آج ۱۹۴۰ء میں بھی کتنے ہی اصحاب ایسے ملیں گے جنہوں نے "الہلال" کے فائل سینوں سے لگائے ہوئے ہیں اور بڑی سے بڑی قیمت پر بھی دینے کو تیار نہیں۔

غرضیکہ "الہلال" نے اپنی مذہبی دعوت کی بدولت مسلمانان ہند کے درمیان بہت جلد ایک مذہبی انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اپنے اصل مقصد میں اس طرح اک گونہ کامیابی حاصل کی۔

لوگ قرآن مجید کے مخزن حکمت سیاست و معاشرت اور علمیت کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور اگرچہ مسلمانوں نے بعض امور میں مولانا آزاد کی مخالفت کی مگر آخر کار انھیں بھی اپنی گردن تسلیم خم کرنی پڑی علماء و مشائخ اور انگریزی خواں

طبقۂ مسلم جو "الہلال" کی پیدائش سے پہلے اسلام کے ارکان کا مذاق اڑاتے تھے اب ادن کی ادائگی کو زندگی کا اہم جزو سمجھنے لگے۔

"الہلال" کی زبردست کامیابی کے دلائل

"الہلال" جن مقاصد کو لے کر اُٹھا تھا ادن میں سے چند ایک میں ایسی شاندار کامیابی ہوئی کہ مخالفین بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے اور ادھیں بھی ماننا پڑگیا کہ واقعی "الہلال" وہ پرچہ ہے جس کی اسوقت سخت ضرورت تھی۔

(۱) چنانچہ مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی نے جو ایک عالم متبحر اور مانے ہوئے بزرگ ہیں صاف الفاظ میں فرمایا کہ "الہلال" کی اشاعت سے پہلے ہم اپنی زندگی کے نصب العین اور سیاسی مطمح نظر سے بالکل غافل اور بے پرواہ تھے" ناظرین! یہ اعتراف جو ایک بزرگ اور بڑے پایہ کے عالم کی زبانی کیا گیا کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔

(۲) مسٹر محمد علی (جو بعد میں مولانا مشہور ہوئے) مسٹر شوکت علی (یہ بھی بعد میں مولانا کہلائے) اور ڈاکٹر اقبال کو اخبار "الہلال" ہی نے مذہب کی راہ دکھلائی۔ اور وہی مسٹر محمد علی صاحب جو مسلم یونیورسٹی کے متعلق "الہلال" کے مضامین کی "کامریڈ" میں مخالفت کر چکے تھے بالآخر مسلم یونیورسٹی کے متعلق "الہلال" کی تقلید ہی میں آواز بلند کرنے لگے۔

(۳) مسٹر شوکت علی صاحب (برادر محمد علی) کا مقولہ تھا کہ "الہلال" نے ہم کو ایمان کا راستہ بتا دیا۔

(۴) فخر پنجاب علامہ اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" بھی "الہلال" ہی کی صدائے معکوس ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ان بے شمار خوبیوں کی بنا پر جو ان میں قدرت نے پوری پوری سخاوت کے ساتھ بھر دی ہیں اونکی اس مذہبی تجدید کے لئے جو "الہلال" کے کالموں کے ذریعہ عمل میں آئی مجدد عصر کہہ دیں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ واقعات و حالات ہمارے سامنے ہیں نتائج کو ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں مولانا کی صداقت پرستی ثبوت ایک بار نہیں کئی بار معمولی نہیں بلکہ زبردست اور ٹھوس مل چکے ہیں اور زمانہ پر اون کے اثرات نظر آرہے ہیں۔

اب ناظرین خود ہی "کامریڈ" اور "الہلال" کا سیاسی و مذہبی طور پر موازنہ کرلیں اور پھر نتیجہ نکالیں کہ کس اخبار کو ملک اور قوم نے صحیح معنوں میں سینوں سے لگایا اور سر پر جگہ دی اور اسپر عمل کیا گیا۔

ہر دو اخبارات کا حشر

(۱) کامریڈ کا انجام!

یہ تو ظاہر ہو چکا کہ "کامریڈ" کس شان سے جاری ہوا اور ترقی و مقبولیت کے کس درجہ پر پہونچا اور کن کن عالی مرتبت لوگوں نے اوسکی حوصلہ افزائی کی۔

جس کے بعد ایسے اعتبار کا مٹ جانا ذرا مشکل امر ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر آج تک نہیں تو کم از کم مولانا محمد علی مرحوم کے بعد بھی کتنی ہی مدت تک وہ عروج کی انتہائی منزل پر چمکتا رہتا بشرطیکہ وہ کلکتہ ہی کی زمین پر قائم رہتا جہاں کی آب و ہوا اسے راس تھی مگر اتفاق کی بات کہ حکومت ہند نے دارالسلطنت کلکتہ کی بجائے دہلی کو قرار دیا اور تمام دفاتر دہلی میں تبدیل کر دیئے گئے۔ چونکہ ،، کامریڈ،، برطانوی حکام اور سلطنت کے سربرآوردہ لوگوں ہی کے ہاتھوں عروج کو پہونچا تھا اور اب بھی انہیں ہاتھوں سے پرورش پا رہا تھا اس لئے مولانا محمد علی صاحب نے بھی ،، کامریڈ ،، کا دفتر کلکتہ سے دہلی میں تبدیل کر دیا۔

چنانچہ دہلی کی آب وہوا اسے راس نہ آئی اور مشکلات کا وہ باب شروع ہو گیا جس نے بالآخر ،، کامریڈ ،، کو عارضی طور پر معدوم کر دیا۔

”الہلال“ کا انجام

”الہلال،، کی ترقی اور رشک آمیز عروج کا حال بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ کتنی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اور تھوڑے سے عرصہ ہی میں یہ نونہال پرچہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا تھا۔ مگر چونکہ اسکی سرپرستی اور پرورش کا سلسلہ حکومت کے معززاور مرفع الحال اراکین کی بجائے قوم کے غریب اور خالی ہاتھوں میں تھا اسپر بھی ،، الہلال ،، اپنی عمر کے آخری دن تک اوسی شان سے چمکتا رہا اور اسکی اشاعت میں ایک عدد کی بھی کمی نہیں ہوئی وہ لوگ خوب جانتے ہیں جنھوں نے اوس کا زمانۂ عروج دیکھا ہے کہ ”الہلال“

ہواہ اپنے ادارہ کو مجبور کرتا رہتا تھا کہ وہ اوسکی تعداد اشاعت میں اضافہ کریں اب ایسے ہر دلعزیز اور اپنا سب کچھ فروخت کرکے بھی خریدنے کے لائق پرچہ کا معدوم ہونا ضرور تعجب کی بات ہے۔ مگر مثل مشہور ہے کہ "ہمیشہ نہ کوئی رہا ہے نہ رہیگا" اس لیئے اسے بھی آخر ختم ہونا ایکدن ضرور تھا۔ مگر دیکھنا ضرور تھا۔ مگر دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس کا انجام کیونکر ہوا۔ وہ بھی سنیئے۔

یہ تو ہم بتا آئے ہیں کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کے چھڑجانے سے ہندی مسلمانوں کا ترکوں سے تعارف ہوا جس کے بعد مذہبی اخوت کی بناء پر ایک خاص لگاؤ اور محبت قائم ہوگئی۔ اور اب ہندوستانی مسلمان سمجھنے لگے کہ ترک جو ہمارے مذہبی بھائی ہیں اور ایک حکومت کے مالک تو اون کا اقتدار ہمارا اقتدار اور اون کا ادبار ہمارا ادبار ہے۔ اس خیال نے رفتہ رفتہ کافی طاقت پکڑ لی۔ کہ اچانک طور پر جنگ عظیم کی چنگاریاں افق یورپ پر نظر آئیں۔ اور بہت جلد منتظر اور بیتاب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ وہی ترکی جسے ہم اپنا بھائی اور بازو تصور کیئے ہوئے ہیں ہماری سرکار برطانیہ کے حلیفوں میں حصہ لیگا۔ اس خبر کی تصدیق ہونی تھی کہ ہر طرف ایک مایوس کن پریشانی اور اضطراب پیدا ہوگیا۔

یہ وہی زمانہ تھا جس کی تشریح میں ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ مسلمانوں کی پوزیشن اسوقت نہایت نازک اور تشویش ناک تھی کیونکہ ایک طرف تو ترکوں کے ساتھ مذہبی اخوت کا رشتہ تھا۔ جس کی وجہ سے ترکوں کے درد سے مسلمانان ہند متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ اور دوسری جانب حکمران وقت کی اطاعت کی

ذمہ داری کا بارِ گراں اون کے دوش پر تھا۔

چنانچہ اسی سیاسی سرگرمی کے دوران میں مولانا آزاد سے گورنمنٹ نے "الہلال" کے متعلق ضمانت طلب کی۔ مگر مولانا نے ضمانت دینا اور اس کے تحت اپنی آزاد آواز کو پابند کر کے نکالنا کسی طرح گوارا نہ کیا اور اخبار کو ۱۹۱۵ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی کاری تلوار سے ذبح کرا دینا منظور کر لیا۔ لہٰذا یہ "الہلال" جو پارۂ آتش کی چنگاریوں کا مجموعہ تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرد کر دیا گیا۔

یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا محمد علی صاحب نے ایک ہزار روپیہ دہلی میں قیام پریس کے وقت "کامریڈ" کی ضمانت کا جو جمع کرایا ہوا تھا وہ اسی جنگ کی ابتدا میں ترکوں کے متعلق ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں ضبط کر لیا گیا تھا۔ جس کے بعد "کامریڈ" کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی۔ اور پھر اس کا انجام بھی قریب ہی آ پہونچا تھا۔

میرے خیال میں بیجا نہ ہوگا کہ یہاں زیادہ نہیں صرف چند کلمہ مولانا محمد علی صاحب کے متعلق عرض کر دوں تاکہ میرے دل میں جتنی وقعت ہے اوس کا کچھ اندازہ لگایا جائے۔ اور اس طرح ایک شخص کی پوزیشن صاف ہو سکے۔ یعنی راقم الحروف کی۔

حقیقت میں مولانا محمد علی صاحب مسلمانوں کا سچا درد دل میں رکھنے والے ایک ناقابل فراموش ہستی تھے۔ وہ پبلک لائف میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرتے رہے اور ہمیشہ غریب مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے

سینہ سپر رہے۔ اور غریبوں کے ساتھ مل جل کر اون کے جذبات و خیالات معلوم کرنا شان آجکل کے فیشن ایبل لیڈروں کے کسرِ شان نہ سمجھتے تھے۔ یہ مولانا محمد علی صاحب ہی کا امتیازی شیوہ تھا کہ غریب اور امیر سب سے کندھا ملا کر چلتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اونکی سی بلند شخصیت کا مالک اور اون جیسا قوم کا سچا بہی خواہ شاید ہی کوئی نظر آتا ہے۔ اون کے دل میں قوم کا درد تھا اور اوس درد میں تڑپ بھی موجود تھی جس سے بیتاب ہو کر وہ مردانہ وار میدان میں نکل آئے اور آخر کار عمر عزیز اسی میدان میں صرف کر دی۔ کاش! مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد کی سیاست میں یک نظری اور اتفاقیہ ہو جاتا تو آج ملک اور قوم دونوں ہی ان دو فرشتہ صفت ہستیوں کے طفیل نہ معلوم ترقی کی کتنی منازل طے کر چکے ہوتے۔ مگر افسوس قدرت نے ایسا بے بہا جوہر ہندوستان کے بد قسمت مسلمانوں سے اوس وقت چھین لیا جبکہ یہ دونوں سیاست کے مرد میدان ایک مرکز پر قائم ہونے ہی والے تھے۔

اب وہ وقت آگیا تھا کہ مسلمان بے چینی سے اپنی سیاسی غلطی کو محسوس کرنے لگے اور افسوس و حسرت سے شاہراہ سیاست کو دیکھنے لگے۔ جس پر برادران ہنود تقریباً نصف سفر ختم کر چکے تھے مگر اب زیادہ دیر کرنی اور بھی مضر تھی اس لیے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں یکایک ایک تغیر عظیم نمودار ہوا۔ اور اب مسلمان بھی اوسی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔

اِس تغیر کی وجوہات کئی ایک تھیں مگر اون میں سے ایک وجہ جو سب سے زیادہ محسوس ہوئی اور جس نے مسلمانوں کو اوس خوبصورت فریب سے نکالا

جس میں یہ اب تک مبتلا تھے۔ دربار تاجپوشی کے موقعہ پر جو انہیں دنوں میں دہلی میں منعقد ہوا تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان تھا۔ چنانچہ اس واقعہ سے تعلیم یافتہ مسلمان اپنی سیاسی پالیسی کو تبدیل کرنے کے قائل ہو گئے۔ اور اب کسی ایسے پیر، مرشد یا رہبر کامل کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان کو راہِ راست پر لگا دیتا۔

چنانچہ عین یہی وہ وقت تھا جبکہ "الہلال" اپنی تمام تر بیان کی ہوئی خوبیوں کے ساتھ مسلمانوں کے نئے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوا کلکتہ سے شائع ہوا اور پردۂ غیب سے وہ شخص نمودار ہو گیا جس کی زمانہ کو اسوقت ضرورت تھی چنانچہ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ اسکے شیدا ہو گئے اور اسکی پالیسی کو جو اسوقت تک صرف ایک بنیادی اصول پر بحث کر رہا تھا۔ صرف ایک بنیادی اصول پر بحث کر رہا تھا اپنے لئے مشعل ہدایت بنالیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک سیاسی تجویز

مولانا آزاد کی تقریروں اور تحریروں نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ پر جو گہرا اور خوابِ غفلت سے چونکا دینے والا اثر ڈالا وہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔

چنانچہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے سکرٹری کی حیثیت میں سر سید وزیر حسن صاحب جو اب سر سید وزیر حسن ہیں۔ مولانا آزاد سے ملے اور انھوں نے تجویز

پیش کی کہ مسلم لیگ مطلق العنانی برطانی حکومت سے اندھی وفاداری کا نصب العین بدل کر مناسب قسم کی سیلف گورنمنٹ کو اپنی منزل قرار دے۔

گویا پورے دس برس بعد مسلم لیگ کے اراکین نے اپنی سیاسی غلطی اور پرفریب امید پر اتنا وقت ضائع کر دینا محسوس کیا۔

اسوقت تک کانگریس پارٹی بھی کوئی ٹھوس اور نتیجہ خیز نصب العین قائم کرنے میں بہت آگے نہ بڑھی تھی اگرچہ دادابھائی نارو جی نے ہندوستانی سیاسیات میں سوراج کا لفظ داخل کر دیا تھا مگر یہ مکمل آزادی کے خواہاں اور صحیح نکتہ رس اصحاب کے نزدیک کچھ نہیں تھا۔

مولانا آزاد کی رائے تھی کہ ہمارے نظریہ کی آخری حد کے لئے یہ لفظ ناکافی ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر حد قائم کرنی چاہیئے۔ مگر مسلم لیگ کے لئے کانگریس کا اتنا قدم بھی ایک زبردست چھلانگ تھی جس کی ہمت وہ اپنے اندر نہ پاتی تھی۔

مگر چونکہ اس تذبذب اور کشمکش کے زمانہ گذشتہ بھی مولانا آزاد مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی جو دونوں ادارہ مولانا محمد علی صاحب کی جانکاہی اور سرگرم کوششوں کا نچوڑ تھیں صدر رہ چکے تھے۔ اس لئے اراکین مسلم لیگ کچھ لمحہ کے لئے مولانا آزاد کی تجویز پر غور و فکر کرنے کے لئے منہمک ہوگئے۔

اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں "الہلال" ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی زد میں آکر ہمیشہ کے ابدی نیند سو گیا تو مولانا آزاد نے اپنے مشن کو جاری اور قومی خدمت کو قائم رکھنے کے لئے دوسرا قدم اٹھایا جس کا ذکر آگے ملاحظہ ہو

اخبار البلاغ کا اجراء

یعنی

مولانا آزاد کی دوسری سیاسی چنگاری

مولانا ابوالکلام آزاد کو " الہلال " کے بند ہو جانے سے جو کثیر مالی نقصان برداشت کرنا پڑا وہ تو ایک طرف۔ سب سے زیادہ نقصان یہ پہونچا کہ اون کی وہ تعلیم جو اب بہت حد تک کامیابی کی منزل کے قریب پہونچ چکی تھی ناکام رہ گئی۔ یعنی مسلمانوں میں جو عام سیاسی بیداری اور تعلیم یافتہ طبقہ میں مذہب سے از سر نو انس پیدا ہو چلا تھا۔ " الہلال " کے معدوم ہونے سے رک گیا۔ مگر یہ کام ایسا نہ تھا جسے یوں ادھورا چھوڑ دیا جاتا۔ فوراً ہی دوسرے پرچہ کی تیاری شروع کی اور چند ہی ہفتہ بعد دوسرا اخبار " البلاغ " کے نام کلکتہ سے جاری کر دیا۔

آپ کا یہ اخبار " البلاغ " بھی کسی طور پر کم نہ تھا اور کسی بنج کم ہونیکی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ وہی قلم وہی زبان وہی دماغ اور وہی پالیسی پھر کوئی فرق یا کمی ہوتی تو کیوں ؟ ہاں اگر کمی تھی صرف اتنی کہ اوس کا نام " الہلال " تھا اور اس کا نام " البلاغ "

کام جاری کر دیا گیا اور پھر اوس شاہراہ پر قدم اٹھنے لگے مگر چونکہ

تیز روی پر ابھی ابھی "الہلال" کو کچلا جا چکا تھا اس لئے قدم تو اوسی راہ پر پڑنے لگے مگر پہلے کی نسبت ذرا احتیاط اور نرم روی سے۔ تاکہ وہ زمین جو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تباہ کن سیلاب سے پولی اور نرم پڑ گئی تھی ایک دم سخت قدم پڑنے سے "الہلال" کی طرح "البلاغ" کے قدم بھی اوس میں نہ دھنس جائیں۔

مگر کہیں حق بھی دبی زبان سے کہا گیا ہے؟ دوسرے ہی تیسرے پرچہ میں صداقت بیان کی تلخی محسوس ہونے لگی۔ اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نے "البلاغ" کو بھی تاکنا شروع کیا اور اپنے نئے اسلحہ سے پہلے ہی تیار ہو بیٹھا "البلاغ" کی نگاہیں بھی غافل نہ تھیں وہ بھی اس صورتِ حال سے بے خبر نہ تھا کہ اس دفعہ کوئی دوسرا وار کیا جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے پر بھی حق و صداقت کی آواز دھیمی نہ کی اور تہیہ کر لیا کہ خواہ انجام کچھ ہو مگر قوم کی خدمت کا جو بیڑہ اُٹھالیا ہے وہ اوٹھا لیا۔ اب قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ جو ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا کہ "البلاغ" کی اشاعت ہوئے چند ہی مہینہ بعد بجائے ضمانت وغیرہ کی تلوار سے ذبح کرنیکے اس دفعہ خود قابل ایڈیٹر مولانا آزاد کو حکومت بنگال نے صوبہ بدر کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور ۲۳ر مارچ ۱۹۱۶ء کو حدود بنگال سے چلا جانے کے لئے حکم نافذ کر دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر بندی!

مولانا آزاد کی شخصیت کچھ کم اہم نہ تھی گورنمنٹ گہری نظروں سے آپ کی ہر ہر حرکت اور ہر ہر قدم کو دیکھا۔

سمجھ رہی تھی۔ جس کے نتیجہ میں پہلی مرتبہ آپ کی زبان بندی اس طرح کی کہ اخبار "الہلال"، کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا نشانہ بنا دیا اور اب مولانا کی خودداری اور آزاد خیالی پر مبنی اخبار کی پالیسی کو پہلے سے زیادہ وسیع دیکھ کر انھیں صوبہ میں رکھنا ہی مناسب نہ سمجھا۔

مولانا آزاد کو ایک ہفتہ کے اندر اندر صرف کلکتہ ہی نہیں صوبہ بنگال کی حدود سے باہر ہو جانے کا نوٹس مل گیا لہٰذا اخبار۔ "البلاغ"، کو بھی بند کرنا پڑا اور اس قومی خدمت کے ناتمام رہ جانے پر باحسرت دیاس سرزمین بنگال کو کئی سال کے قیام کے بعد ایک نامعلوم مدت کے لئے چھوڑ دینے کے ارادے سے ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو کلکتہ سے روانہ ہو کر رانچی چلے گئے۔

چونکہ پنجاب، یو۔پی، بمبئی، اور دوسرے صوبوں کی حکومتوں نے اپنی حدود میں ان کا پہلے ہی داخلہ بند کیا ہوا تھا اور ہر صوبائی حکومت آپ کے آزاد خیالات کی جھلسا دینے والی چنگاری پہلے ہی مخدوش تھے اس لیئے ہر طرف نظر دوڑانے کے بعد رانچی شہر ہی مناسب اور موزوں معلوم ہوا۔

ابھی آپ پورے طور پر مطمئن ہو کر کسی خاص راہ عمل اختیار کرنے میں کامیاب بھی نہ ہوئے تھے کہ سرکار عالیہ نے پانچ مہینہ بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔

اور رانچی شہر کے باہر مورآبادی نامی ایک گاؤں میں بالکل یکہ و تنہا مقیم کر دیئے گئے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں اُس وقت شہریت کی بو تک نہیں پائی جاتی تھی کوئی مہذب انسان نظر آتا تھا نہ کوئی سفید پوش حتی کہ کوئی ہم مذاق وہم طبیعت بھی موجود نہ تھا کیونکہ اس کے ارد گرد تمام علاقہ میں وحشی اور غیر مہذب اقوام رہتی سہتی ہیں۔

اب مولانا ابو الکلام آزاد خود اپنے کو مستقل نظریہ سے ہر سختی سے کاربند ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ سے اپنی رہائی کے متعلق گفت و شنید کیوں کرتے۔ اوس میں اونکی کمزوری اور ہتک بھی پائی جاتی تھی مگر اس جلاوطنی کے دوران میں آپ کے چند اور خاص احباب و خوش عقیدہ اصحاب نے اس جلاوطنی و نظربندی کے حکم کو منسوخ کرانے کے لئے گورنمنٹ کو درخواستیں بھیجیں جنپر بلا مبالغہ کم از کم ساٹھ ہزار اشخاص نے دستخط کئے اور آپ کی رہائی چاہی مگر گورنمنٹ نے موقعہ اور وقت کی نزاکت کو ملحوظ اور رموز مملکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اون درخواستوں پر جو ملکی معززین و اکابرین اور بااثر حضرات کی دلی خواہشات کی حامل تھی۔ کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

اور قریب قریب چار سال کا زمانہ یعنی سنہ ۱۹۲۰ء تک آپ اسی مقام سوڑیا ڈی نامی گاؤں میں نظربند رہے۔

جلاوطنی کا یہ زمانہ آپ نے انتہائی صبر و شکرگزاری میں بسر کیا اور ہر حالت میں مرضیٔ مولا پرست کر رہے۔ مشغلہ آپ کا ان ایام میں اون وحشی افراد کو وعظ و تلقین کرنا اور عبادت و ریاضت میں شب و روز گزارنا تھا۔

مولنا ابوالکلام آزاد
کی
رہائی

یہ وہ وقت تھا جبکہ جنگ عظیم جاری تھی اور پورے زور سے انسانی خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔ ہندوستانی میں مسلمانوں کی حالت نازک سے نازک تر ہورہی تھی کیونکہ جنگ ترکوں سے تھی اس لئے مسلمان "دو ملاؤں میں مرغی حرام" کے مصداق ہورہے تھے۔ ایک طرف حکومت سے وفادارانہ رویہ رکھنے پر مجبور تھے اور دوسری طرف ترکوں کے ساتھ مذہبی اخوت کا رشتہ بے چین ومضطرب کئے ہوئے تھا۔ خصوصاً مسلم لیڈر جن کے دل اپنے دینی بھائی ترکوں کی اس مصیبت سے زیادہ بے کل تھے۔ گورنمنٹ کی نظروں میں بہت مخدوش تھے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کو جو اس جلاوطنی کے مصائب جھیلے اور کافی مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اوس میں اس جنگ عظیم کی وجہ سے پھیلی ہوئی بداعتمادی کو زیادہ دخل تھا۔ اسی لیئے آپ اوسوقت تک رہا نہ کئے گئے جب تک کہ جنگ ختم نہ ہوگئی، اور وہ بھی اوسوقت جبکہ جنگ عظیم کے دیگر تمام نظر بندوں کو یکے بعد دیگرے تمام نظر بندوں کو یکے بعد دیگرے رہائی مل گئی تو ۱۹۲۰ء میں سب سے آخر میں انھیں رہا کیا گیا۔

جب مولانا ابوالکلام آزاد اوس نظر بندی سے چار سال بعد ۱۹۲۰ء

کے اواخر میں آزاد ہو کر آئے تو مسلمانان ہند کی قدیم سیاسی ذہنیت اور پچھلا سانچا ٹوٹ چکی تھی ملک اپنی اس افسوس کن سیاسی غلطی کو محسوس کر کے کسی نئی راہ عمل کی تجویز اور ایک نیا سانچا ڈھالا جا رہا تھا۔ اور ہندوستان بھر کے عالمان دین متفقہ طور پر اس فیصلہ پر کار بند نظر آئے کہ اس کشمکش اور پر آشوب زمانہ میں سیاسی اور خصوصًا مذہبی مسائل میں صاف اور سلجھی ہوئی سوجھ بوجھ رکھنے والا اسوقت مولانا آزاد سے زیادہ اور کوئی شخص نہیں ہے ۔ اور یہ کہ بلا امتیاز مسلمانوں کے ہر فرقہ و گروہ پر ان کا احترام واجب ہے چنانچہ آپکی قابل قدر خدمات اور بلند پایہ علمی قابلیت کو سراہا گیا اور مسلمانوں پر اب اک نئے نظریہ کا مستحکم طور پر قیام ہوا ۔۔

گاندھی جی سے ملاقات
اور
خیالات میں یگانگت

اب چونکہ ملک کی فضا جنگ کے ختم ہو جانے سے بہت کچھ صاف ہو گئی تھی اور قومی و ملکی لیڈروں کی زبان اور قلم کچھ آزادی سے کام کرنے لگی تھیں اس لیے مولانا ابو الکلام آزاد نے کوئی ٹھوس اور معینہ نظریہ رکھنے والا ادارہ تلاش کرنا شروع کیا جس کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اپنے مذہبی نظریہ سے پبلک کو روشناس کرا سکیں ۔

گو اس سے پہلے اخباری دنیا کے ذریعہ آپ نے بہت کچھ اپنے خیالات کی اشاعت کی مگر چونکہ اب وہ ذرائع ختم ہو چکے تھے اور طبیعت بھی کسی دوسرے طریق کار کی متحمل تھی اس لیئے آپ ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی سے ملے۔
اور کافی تبادلہ خیالات اور گفتگو کے بعد آپ نے گاندھی جی کے اس زبردست اصول سے اتفاق کر لیا جسے گاندھی جی اپنی سیاسی زندگی کے اول روز سے قائم کئے ہوئے ہیں یعنی عدم تشدد کے سرگرم اور پرزور حامی بن گئے اور اوس دن سے آجتک برابر اوسی نظریہ پر اور اوسی جگہ پر قائم ہیں۔

گو آپ اس سے قبل مسلم لیگ اور پرانی آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہ چکے ہیں جیسا کہ اوپر بھی بتا آئے ہیں مگر اپنے انقلاب پسند دماغ کی صحیح ترجمانی کے لئے کوئی مقام موزوں نہ معلوم ہوا۔ اور زمانہ و وقت کی رفتار نے آپ کو کانگریس تک پہونچا دیا جو دراصل ایسے ہی مخلص کارکن اور قوم کے سچے ہمدردوں کی متلاشی تھی۔ لہذا آپ ۱۹۲۳ء میں کلی اور قطعی طور پر پرانی سوراج پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اور مسلم لیگ و دیگر اداروں سے قطعی طور پر علیحدہ ہو گئے۔ اور کچھ عرصہ بعد جب خلافت نے بھی اپنا سیاسی میدان تنگ اور محدود کر لیا تو آپ نے اس سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ اور صرف کانگریسی بنکر پورے طور پر میدان میں آ گئے۔ آپ کی رائے اتنی صائب اور صحیح ہوتی تھی کہ آپ مرحوم سی آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو جو پنڈت جواہر لال نہرو کے والد بزرگوار اور کانگریس پارٹی کے روح رواں کارکن

اور اک زبردست شخصیت کے مالک تھے) کے بارسوخ اور معتمد شریک کار اور مسلمانوں میں بھروسہ کے قابل اور ذمہ دار شخصیت کے مالک تھے۔

کانگریس اور جمعیۃ العلماء ہند دہلی

کانگریس میں آپ کی شرکت مسلمانانِ ہند کے لئے کسی پیچیدہ اور الجھے ہوئے سوال کا حل تھا۔ چنانچہ انھیں ایام میں کتنے ہی آزاد خیال لوگ کانگریس سے وابستہ ہو گئے اور اب ذرا ایک قدم آگے بڑھ کر کام کرنا شروع کیا۔

اسی زمانہ میں علمار اسلام نے بھی ضرورت محسوس کی کہ ہمیں باقاعدہ طور پر ایک مرکزی حیثیت قائم کر کے منظم ہونے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مسلمانو کا یہ معتدر اور بزرگ طبقہ جو دینی رہبری اور مذہبی پیشوائی کا فرض اپنے دوش پر لئے ہوئے ہے۔ ایک جماعت کی شکل میں منظم ہوگیا اور جمعیۃ العلمار ہند اس ادارہ کا نام رکھا۔

چونکہ اس طبقہ کا تعلق بھی مسلمانوں کی قسمت سے بہت کچھ ہے اس لئے ضرورتاً اسے بھی کسی سیاسی پارٹی سے دستبردار ہونا لازمی تھا۔ موجودہ سیاسی کشمکش میں حصہ لینا لازمی اور ضروری تھا۔ چنانچہ جمعیۃ العلمار ہند کے کرتا دھرتا لیڈروں نے کافی نشیب و فراز سوچنے اور سمجھنے کے بعد اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا کہ ہمیں مسلمانوں کی صحیح اور حقیقی نمایندگی اور خدا و رسول کے سامنے سرخروئی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ ہم کمل آزادی کا نصب العین رکھنے والی جماعت کے ساتھ ملکر کام کریں تاکہ ایک اور ایک دو کیا ایک اور ایک

گیارہ بلکہ سیاسی گتھیوں کو کم سے کم عرصہ میں سلجھا سکیں ۔ نہ مسلمان اسوقت تک صحیح معنی میں مسلمان نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ وہ ہر طرح آزاد نہ ہو۔

چنانچہ ۱۹۱۹ء میں علماء کرام کے اس طبقہ نے بھی جمعیۃ العلماء ہند کے نام سے موسوم کر کے اپنی باقاعدہ جماعت بنائی۔ اور گزشتہ حالات و تجربات، اور اپنے نظریہ کی جانچ کی بناء پر اسوقت کی سیاسی جماعتوں میں سے انڈین نیشنل کانگریس پارٹی کی راہ عمل اور نصب العین اپنی تجویز کردہ راہ عمل اور مقرر شدہ نصب العین سے ملتا ہوا پایا جس کے بعد یہ اپنی راہنماؤں کی جماعت بھی سیاسی جماعت کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کر کے سیاسی میدان میں کام کرنے لگ گئے ۔ جسے مسلمانوں میں اتنا رسوخ و اثر حاصل ہے کہ ان علماء کے پیرو آج لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اگرچہ مسلم لیگ علمائے دین کی سرگرمیوں سے بہت سیخ پا ہے اور کئی بار ان کی مذمت کر چکی ہے اور انہیں اپنے ضمیر کی خاطر بہت سے مصائب برداشت کرنے پڑے ہیں تاہم اس جماعت کو مسلمانوں میں جو اثر و رسوخ حاصل ہے وہ اور کسی جماعت کے حصہ میں نہیں آیا۔ تحریک خلافت کے عروج کے زمانہ میں جمیعۃ العلماء ہند کا حکم مسلمانوں کے لئے قانونی درجہ رکھتا تھا۔ اسوقت کی سوراج پارٹی مسلم رہنماؤں کی سیاست کام کر رہی تھی۔ اور مسلمانوں کو پورا پورا اقتدار و اعتماد حاصل تھا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ مسلم لیڈروں کی شمولیت ہی سے کانگریس کانگریس کہلانے کی مستحق ہوئی ورنہ اس سے پہلے نہ کانگریس کی آواز اتنی وزندار تھی اور نہ اتنی شہرت و مقبولیت ۔

مولانا محمد علی مرحوم۔ ڈاکٹر انصاری اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب جیسے مایۂ ناز حضرات بھی اسوقت کانگریس ہی کے پلیٹ فارم پر کام کر رہے تھے اور انھیں بزرگان قوم و ناموران ملک و دیگر مولانا ابوالکلام آزاد مسٹر آصف علی صاحب بیرسٹر جیسی مقتدر ہستیاں اور جمعیۃ العلماء ہند کے معزز اراکین ہی کانگریس کو بام عروج پر لانے اور گورنمنٹ سے باقاعدہ جماعت تسلیم کرانے والے تھے۔

مولٰنا ابوالکلام صاحب آزاد
کی
پہلی صدارت

اب کانگریس اور اس مقام پر پہونچ گئی تھی کہ کچھ آگے بڑھ کر کام کرے اور قانونی مرکز پر فائز ہو کر اس ادارہ پر قابو حاصل کرلے جس کے ذریعہ ملک و قوم کے لئے مفید قوانین مرتب اور نقصان دہ قوانین کی تردید و تنسیخ کرسکے۔

لہٰذا اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک اجلاس بلایا گیا اور اس میں یہ ریزولیوشن رکھا گیا کہ کانگریس کے نمائندوں کو اسمبلی (یعنی قانون ساز کونسل) میں جاکر اپنے ملکی و قومی مفاد کی حفاظت کرنی چاہیئے اور سول نافرمانی کی سکیم کو جو اسوقت زیر بحث تھی ملتوی کردینے کی رائے تجویز ہوئی۔

مگر اس مقصد کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے ہر پہلو پر کافی طور سے پہلے غور کرلینا ضروری اور مناسب تھا تاکہ بعد میں یہ نہ محسوس ہو کہ یہ قدم غلط اٹھایا گیا تھا اور جس کی وجہ سے کوئی ایسا نقصان رونما ہو جس کی بناء پر اس مکمل ادارہ کا قدم بجائے آگے اٹھنے کے کئی سال پیچھے ہٹ جائے۔ لہٰذا اس امر پر ہر لحاظ سے غور و خوض کرنے کے لیئے ایک کمیٹی کا تقرر ہوا۔

اس سی-ڈی-او کمیٹی (سول نافرمانی ملتوی کرنے کے سوال پر غور کرنے والی کمیٹی) نے کافی بحث و تحیص اور غور و فکر کرنے کے بعد اپنی اقلیتی رپورٹ پیش کی۔

مگر اس رپورٹ میں کچھ نکات ایسے گہرے تھے کہ ان پر ممبران میں کشمکش چھڑ گئی۔ اور اختلاف رائے نے اتنا زور پکڑا اور ایسی الجھی ہوئی شکل اختیار کرلی کہ باوجود کوشش کے بھی ایک فریق دوسرے فریق کی نظریہ سے متفق نہ ہوسکا۔ جب ہر ممکن بحث و مباحثہ اور کافی تبادلۂ خیالات ہونے پر بھی یہ قوم اور ملک کے بہی خواہ ایک نکتہ پر متفق الرائے نہ ہوسکے اور ہر فریق اپنی جگہ پر اس خیال سے سختی کے ساتھ قائم رہا کہ وہ اپنی رائے ملک اور قوم کے لئے مفید اور دوسری پارٹی کا نکتۂ نگاہ مضر سمجھا جاتا تھا تو مجبوراً اس مسئلہ کے فیصلہ کے لیے آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلانا پڑا۔

یہ اجلاس کچھ معمولی اجلاس نہ تھا جسے ملک اور قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔ جس کی ذرا سی غلطی اسوقت قوم اور ملک کو برباد کر دینے والی ثابت ہوسکتی تھی اور جس کا بہتر اور احسن فیصلہ ملک اور قوم کو کامیابی کی منزل کے

فریب ترکر ہو نے والا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہر دو فریق اپنی اپنی رائے میں اپنے خیال کر ملک و قوم کے حق میں مفید اور دوسرے گروپ کے نظریہ کو نقصان دہندہ سمجھتے ہوئے ایک انچہ بھی اپنی رائے سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

بحث اس چیز پر تھی کہ سول نافرمانی کرنے کی تجویز جو اسوقت زیر غور تھی ملتوی کی جائے یا نہیں اور اسمبلیوں میں اپنے نمائندے بھیجکر وزارتیں حاصل کی جانی چاہئیں یا نہیں ؟ تاکہ حکومت کی مخالفت باثر طریق پر کی جا سکے۔ چنانچہ ایک فریق اس تجویز کے حق میں تھا اور دوسرا مخالفت میں۔

غرضیکہ یہ اہم اور تاریخی اجلاس ۱۹۲۳ء کے اواخر میں ہندوستان کے پایہ تخت اور مشہور شہر دہلی میں منعقد ہوا۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ ایسے اہم اجلاس کی صدارت کے لئے کس قابل ہستی کا نام تجویز کیا جائے جو اس خاص اجلاس کی اہمیت اور اسکی نزاکت و گہرائیوں کو پورے طور پر سمجھنے اور اس بار کو آسانی سے برداشت کرنے اور اسکی کٹھن منزل کو جو اسوقت قوم کے بہی خواہوں کو درپیش ہے۔ خوش اسلوبی سے انجام دینے کی پوری پوری قابلیت اور اہلیت رکھتا ہو۔ اور نیز یہ کہ اسے موجودہ کشمکش اور دورنگی کے اور اس رائے عامہ کا کلی طور پر اعتماد بھی حاصل ہو۔ لہٰذا اس منصب جلیلہ کے لئے کئی ایک ممتاز اور قابل ہستیوں کے نام پیش کئے گئے مگر ہر ایک کسی نہ کسی وجہ سے مسترد کر دیئے گئے۔ بالآخر مولانا ابوالکلام آزاد کا نام باتفاق رائے منظور کیا گیا۔ اور آپ اس طرح ایسے زبردست اور اہم و نازک اجلاس کے صدر پہلی مرتبہ چنے گئے جس کے یہ

معنی ہوتے ہیں کہ اوسوقت جتنے ممبران ہند اور مسلم کانگریس میں تھے سب کے سب آپکی بزرگی. قابلیت اور علمیت و نیز پاکیزہ جذبات کی خلوصیت کے ایسے قائل تھے اور آپکی قدر کرتے تھے۔ جس کا یہ ثبوت ہے کہ محمد علی صاحب مرحوم۔ ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں۔ مہاتما گاندھی۔ موتی لال نہرو۔ سی آر داس مرحوم اور دیگر ماہران سیاست وعلمیت نے بالاتفاق اگر کسی کو صدر منتخب کیا تو مولانا ابو الکلام آزاد کو ورنہ دوسرے ہر نام پر کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ اعتراض تھا اور وہ نام کچھ رد وکد کے بعد مسترد کر دیا جاتا تھا۔

کانگریس میں تفرقہ

اور

مولانا آزاد کا نظریہ

اجلاس کیا تھا گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا امڈی چلی آرہی ہے ہندوستان کے ہر حصہ سے اور ہر حصہ کے ہر ہر بڑے شہروں سے و نیز ہر آزاد پسند جماعت کے ڈیلیگیٹ اور نمایندے جمع ہونا شروع ہوئے بڑے بڑے عالی نامور لیڈران کا اجتماع ہوا۔ یہاں دور دور سے اپنے اس تاریخی اجلاس کو کامیاب اور پر رونق بنانے کے لئے آکر شامل ہوتی گویا اجلاس کیا تھا کوئی نئی تمہید کا نئی روشنی کا اور نئے دور کا ہندو مسلم دونوں قوموں کا مشترکہ

ایک ملکی تہوار تھا جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر قوم اور ہر خطہ کے آدمی جوق جوق چلے آتے تھے۔

استقبالیہ کمیٹی نے بھی اپنی کوشش اور شان مہمانداری میں وہ خوبی اور حسن کار گری دکھائی کہ اتنے جم غفیر اور اژدہام کو جس میں ہر مزاج ہر طبقہ اور ہر خیال کا فرد تھا۔ ہر ایک آسائش اور آرام بہم پہونچایا۔ مہمانوں کے قیام کا علیحدہ مکمل اور با قاعدہ انتظام کیا گیا۔ اور ہر ضرورت کی چیزیں وقت پر اور مناسب صورت میں مہیا کی جاتی رہیں۔ اور اجلاس کے دیگر کل امور و انتظام مکمل طریق پر انجام دیئے لوگوں کے جوش اور ولولوں کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص خود کو ملک اور قوم کا فدائی اور رضا کار تصور کرتا تھا جب کسی کو جو حکم استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے دیا گیا اوسے تن دہی اور اپنا ذاتی کام تصور کرتے ہوئے کرنا ایک ایسی شان تھی جو بیان سے باہر تھے۔ غرضیکہ اک عجیب شان و شوکت والا اجلاس تھا جس کو کامیاب بنانے کے لیئے ہر شخص کے چہرے سے اخلاص و ہمدردی ٹپکی پڑ رہی تھی۔

اجلاس ہوا اور ضروری کارروائیوں کے بعد ارکان جلسہ نے ریزولیوشن سامنے رکھا۔ رائے زنی ہونی شروع ہوئی اور بحث و تمحیص نے اس دفعہ کا بھی اس قدر طول کھینچا کہ اختلاف رائے کی بنا پر ہندو کانگریسی ممبران میں اور مسلم کانگریسی ممبران میں بھی دو دو پارٹیاں قائم ہو گئیں۔

سوراج پارٹی جو اس بات کی خواہاں تھی کہ اب پارلیمنٹری پروگرام سے پابندی اوٹھا لینی چاہیئے اور اپنے ممبران کو اسمبلیوں میں بھیجنا چاہیئے تاکہ وہ

حکومت کی مخالفت اور اپنے موافق قوانین کو پاس کرانے میں شدت سے کام کریں۔ ایک طرف ہوگئی اور دوسری پارٹی جو اس تبدیلی کی ضمانت بھی اس رویہ کو مضر سمجھتے ہوئے دوسری طرف ہوگئی۔

چنانچہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، اور بہت سے قابل حضرات سوراج پارٹی کے ہم خیال ہو کر ان سے وابستہ ہوگئے اور مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور ڈاکٹر انصاری اور کچھ دیگر مدبران قوم و اکابرین ملک اس تجویز کی مخالفت میں ہو کر تبدیلی کی مخالفت کرنے والے (نو چینجر) میں جا ملے اور افسوس ایک نظریہ پر دونوں فریق آخر تک قائم نہ ہو سکے۔

چونکہ اس اجلاس کا منشا یہی تھا کہ اس میں اس مسئلہ کو خواہ کسی صورت پر بھی ہو فیصل کیا جائے اس لیئے کثرت رائے ہونے کی بنا پر سوراج پارٹی کے خیال کی تائید میں فیصلہ رو نما ہوا یعنی پارلیمنٹری پروگرام (پارلیمنٹ اسمبلیوں میں جا کر کام کرنا) سے پابندی اٹھالی گئی۔ اور سوراجیوں کو اسمبلیوں میں جا کر حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے نصب العین یعنی سوراج حاصل کرنے کے پروگرام کو کامیاب بنانے کی اجازت دے دی گئی۔

افسوس یہ اجلاس جن مسرتوں اور جوش و ولولوں کی تمہید سے شروع ہوا تھا ان کی بجائے ہمیشہ ہمیشہ کے ایک نہ ختم ہونے والا اجنبی لغت اور دلی رنج پر ختم ہوا گو سوراج پارٹی کو اپنے نظریہ میں کامیابی ضرور ہوگئی تھی یعنی ریزولیوشن ان کی مرضی کے مطابق پاس ہوگیا تھا مگر آپس میں اختلاف رائے ہونے کی وجہ جو بیج آج دلوں کی زمین میں قائم ہوگیا تھا اس کا انجام بہتر نظر نہیں آرہا تھا۔

ں کا ہر سوراجی گو خواہ وہ مسلمان تھا یا ہندو سخت الم تھا کہ محمد علی جیسی قابل ہستی ہمارے نظریہ سے متفق نہیں ہے۔ مگر کرتے بھی کیا۔ کیونکہ ہر فریق اپنی بلکہ خود کو اوس صحیح راستہ پر سمجھ رہا تھا۔ جو ملک اور قوم دونوں کے لیئے مفید تھا۔ اسی بنا پر کوئی پارٹی دوسری پارٹی کی ہم خیال ہونے پر کسی طرح بھی رضامند نہ تھی۔

ہمیں اس جگہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور اون کے نظریہ سے بحث ہے کہ آپ کا ان دونوں پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کے ساتھ اتفاق رائے ہوا۔ چنانچہ یہ ہم بتلا آئے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد حکومت کی مخالفت کرنے کے لئے اسمبلیوں میں جانے کی تجویز پر متفق جماعت میں سے سوراج پارٹی کہا جاتا ہے شامل تھے۔ اور اوسوقت سے آجتک اپنے اسی نظریہ اور اوسی رائے پر کاربند اور قائم ہیں کہ کانگریس کی پالیسی یہ ضروری ہونا چاہیئے کہ پارلیمنٹری اور غیر پارلیمنٹری پروگرام کے ساتھ ساتھ چلائے جائیں ÷

پارلیمنٹری اور غیر پارلیمنٹری پروگرام

پارلیمنٹری پروگرام جس کا وجود اس تاریخی اجلاس کے وقت وجود میں یعنی اجلاس کے وقت وجود میں آیا۔ کے یہ معنی ہیں کہ اسمبلیوں میں جا کر اس پارلیمنٹ میں شریک ہوں جو ہندوستان کے لیئے قوانین منضبط کرتی ہو۔

سبب ہے جیسی کہ اب تک ثابت ہو تی رہی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسی قابل قدر شخصیت اور ان سے متعلق تمام تر چیزوں کے مجمل حالات اس مختصر سی کتاب میں مشکل ہی سے دکھائے اور بتلائے جاسکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت اتنی عجلت سے اس کتاب کی تیاری عمل میں آئی کہ میں (راقم الحروف) آپ کی پوری سوانح کے حالات فراہم نہ کرسکا۔ مگر پھر بھی اس گنجینۂ صفات اور بلند و برتر شخصیت کی زندگی پر اتنی کچھ روشنی ڈال دی گئی ہے جسے ہم اور ہماری قوم مشعل ہدایت بنا سکتی ہے۔ کیونکہ آپ کی شخصیت ایک مینار راہنما کی طرح کھڑی ہے۔ جس سے ہر وہ نقش راہ جو وصندلے قدم پہ پہنچ کر مٹ رہے ہیں دیکھے اور معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

اگر لوگ سیاسی تعصبات سے اندھے ہو کر اپنی کم علمی یا لاعلمی سے انتقام کے جذبات کے تحت آپ کی اہمیت گھٹانا چاہیں تو یہ بہت مشکل امر ہے۔ بلکہ ان ہونی بات کے مصداق ہے۔

غیر مسلم حلقوں میں بھی وہ اپنے سیاسی تدبر اور عقائد بسر گرمیوں کی وجہ سے مقبولیت کے ساتھ مشہور ہیں لیکن اس مقبولیت بشہرت سے بھی کہیں زیادہ اور بڑھ چڑھ کر آپ کے اوصاف اور اہلیتیں ہیں جنھوں نے آپ کی شخصیت کو ایک ایسی بلندی اور بزرگی عطا کر دی ہے جو عقل و فہم

[illegible]

لہٰذا وہ اتنی بہار پر بڑے بڑے جلسوں میں [illegible]

کر دیتے ہیں۔ مولانا نے اس حد تک بڑھے ہوئے حجاب کو

بڑے ہی دلیل ہے۔ تفسیر القرآن کے مطالعہ سے بڑے بڑے پایہ کے عالم اور فاضل یہ کہنے پر مجبور رہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر القرآن بتاتی ہے کہ آپ قرآنی حقائق اور رموز سے بخوبی واقف ہیں اور عربی زبان پر پوری دسترس حاصل ہے اور یہ کہ روحانیت کے حقیقی معانی عارف حقانی کی طرح سمجھتے ہیں۔

غرضیکہ آپ کی علمی فضیلت اور روحانی نجابت نے آپ کے نام شہرۂ آفاق کر دکھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ زہد و اتقا میں بھی کافی حصہ لئے ہوئے ہیں۔ آپ جہاں سیاسی میدان کے ایک شیر ہیں وہاں عبادت و ریاضت کی دنیا میں ہی بھی ایک ممتاز اور بزرگ ہستی ہیں۔

ایک صاحب کا مقولہ بالکل صحیح ہے کہ اگر ہندو مسٹر گاندھی کو مہاتما مانتے ہیں تو ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمان بھی بالاتفاق مولانا کو مجدد مانیں گے۔

خلاصہ یہ کہ آپ کا گرانمایہ وجود اور قابل فخر ہستی ملک اور قوم کے لیے باعث صد نازش و افتخار ہے آپ کی اعلیٰ قابلیت، آپ کا بے مثل ایثار نفس، آپ کا حیرت انگیز جوش، آپ کا خلوص، اور خدمت و ہمدردی قوم کے پاک جذبات یہ وہ خصوصیات اور خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج آپ کو اپنی قوم ہی میں نہیں بلکہ آزادی پسند ہر جماعت میں خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھتی ہے ایک ممتاز درجہ حاصل ہے ہماری درماندہ قوم کے لیئے آپ کا وجود مغتنمات میں سے ہے اور ہمکو خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ آپ کی قابل قدر ہستی ہماری قوم کے لئے آیندہ بھی بیش از بیش فوائد کا موجب

رہا اور ہمیشہ ہی شریک ہوں جو ہندوستان کے لئے دل آئین منضبط کرتی ہو۔

آپ کا علمی ذوق

یوں تو آپ کے ذاتی کتب خانہ میں بے شمار سیاسی، علمی، مباحث ومناظرہ، تواریخ، معلومات، فلاسفی، منطق، علم سائنس، اقلیدس اور دیگر تمام علوم کی بلند پایہ اور نادر الوجود کتابیں بھری پڑی ہیں مگر ان کے علاوہ تازہ ترین انگریزی اور مشرقی زبانوں کی کتابیں اور ایران، افغانستان، عرب، ترکی، اور مصری اخبارات کا بہت بڑا ذخیرہ خاص احتیاط اور حفاظت سے ہر وقت موجود رہتا ہے۔

آپ کے دوست واحباب کا وہ طبقہ جو خاص احباب کا طبقہ کہلاتا ہے خواہ لاکھ کوشش کریں تب بھی یہ اپنے ذاتی معاملات اپنی ہی حد تک محدود رکھتے ہیں اور کسی کو بھی اپنی کسی حالت میں شریک کار کر کے کسی قسم کی تکلیف دینا گوارا نہیں کرتے۔

آپ کے بلند اور اعلیٰ علمی ذوق کا نتیجہ سیاست ہے تو آپ کی وہ شخصیت ہے جو آج آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں صدر کی حیثیت سے مشہور ہے یعنی آپ کی لیاقت وقابلیت سیاسی کا یہ ذمہ دارانہ عہدہ گویا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اور آپ کی تحریر کو دیکھ کر ایک انسان خود بخود آپ کی علمی فضیلت کا معتقد ہو جاتا ہے۔

اور دینی حیثیت سے آپ کا وقار کا موجب علیحدہ کتنے ہی خدمتی اقدامات کے ایک تفسیر القرآن بھی ہے جو ہندوستان بھر میں ایک عالم متبحر اور بے بدل

[illegible] ایام گزارتے ہیں لہٰذا وہ اتنی بہار پر بڑے بڑے جلسوں میں شریک [illegible] کر دیتے ہیں۔ مولانا کے اس حد تک بڑھے ہوئے حجاب کو

کیونکہ آپ کو ترکی حمام بہت مرغوب ہیں۔
گو یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ اپنے فیشن ایبل اور انگریزی وضع کے دوستوں میں خاموش اور گم سم بیٹھے رہتے ہیں مگر جب کبھی خاص حلقۂ احباب میں ہوتے ہیں تو ان میں کھل بھی خوب جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی لوہنیں دوستوں کی رفاقت میں سیر و تفریح کو بھی نکل جاتے ہیں۔

آپ کا لباس

یہ تو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے بیشمار احباب ایسے بھی ہیں جو انگریزی لباس کو پسند کرتے اور استعمال بھی کرتے ہیں جنسے آپ اوسی بے تکلفی سے ملتے ہیں جیسی کہ ہونی چاہیئے۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ آپ اس لباس سے دلی نفرت رکھتے ہیں۔ اور در اصل ہونا بھی یہی چاہیئے کہ ایک ہندوستانی کو ہندوستانی ہی لباس پہننا چاہیئے اور ہندوستانی ہے تو ہندوستانی ہی معاشرت کا دلدادہ ہو۔ اس کا شیوۂ شرافت ہے۔ چنانچہ آپ باوجود انگریزی فضا میں کافی وقت گزارنے کے بھی اپنا لباس بالکل سادہ مگر صاف اور ستھرا رکھتے ہیں۔ اور کم خرچ۔ آپ شکل و صورت ہی سے پاکباز اور راست باز معلوم ہوتے ہیں آپ کی طبیعت کی سادگی میں شا... لات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔
... بار جمیعت میں شریک ہوں جو ہندوستان کے لیے قوانین منضبط کرتی ہے۔

مشغلہ سے یا یوں کہنا چاہئے کہ ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہیں جن میں
نئے اور پرانے واشنا نا آشنا سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

آپکی مزاجی کیفیت

آپ کی طبیعت انتہائی خوش خلق اور ملنسار ہے۔ اور نہایت
سنجیدگی آپ کی ہر ہر ادا اور اوضاع و اطوار سے خود بخود ظاہر ہو جاتی
ہے بسا اوقات آپ کے پاس لوگ نازک مسائل پر گفتگو کرنے یا
عجیب و غریب شکوک رفع کرنے آتے ہیں تو آپ ان کی ان ضلجان
آمیز باتوں کو نہایت سکون اور اطمینان سے خاموش بیٹھے سنتے رہتے
ہیں۔ جو آپ کی سی حساس اور ساتھ ہی سکون پسند طبع کے لئے نہایت
تعجب کی بات ہے مگر وجہ یہ ہے کہ آپ کے مزاج میں انتہائی ہی
شائستگی، اخلاق، اور رواداری بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے
مخالف خیال حضرات اور دشمنوں کو بھی آپ کی طرف سے کسی قسم کی ذاتی
شکایت کی گنجائش نہیں پائی گئی۔

غصہ تو آپ کو شاید آج تک آیا نہیں۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ
شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو یہ کہہ سکے کہ میں نے آپ کو کبھی غصہ کی حالت
میں دیکھا ہو۔

جب آپ طویل سفر سے قیام کریں یا انتہائی مصروف ایام گزاریں
[illegible]
لہذا وہ آپ [illegible] بڑھتے ہوئے حجاب کو کم
کر دیتے ہیں۔ مولانا کے اس حد تک بڑھتے ہوئے حجاب کو کم

سیح ہیں لوگ کا بہل عارفانہ پایا تا ہیت جیسے ہیں۔ مولانا ایک صاحب دل اور عقاب سی تیز نگاہ رکھتے ہیں۔ اونکی ذہانت تلوار کے جوہر اور بذلہ سنجی خنجر کی کاٹ رکھتی ہے۔ مردم شناسی مولانا کا ایک خاص وصف ہے۔ لیکن خود لوگوں سے اس طرح علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں کہ عام طور پر آپ کے بارے میں آسانی سے کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ یاران زندہ دل کی صحبت میں آپ کا شستہ مزاج اور حاضر جوابی ساری محفل پر چھا جاتی ہے اور جس وقت آپ کا مزاج کسی خاص وجہ سے اس رنگ پر نہ ہو تو ایسی چپ سادھ لیتے ہیں کہ کوئی بڑی سے بڑی اور ظریف سے ظریف بات بھی آپ کی زبان نہیں کھلوا سکتی۔

آپ مناظر اول درجہ کے اور مانے ہوئے دلیر ہیں ایسے ایسے باریک نکات پر آپ کو قدرت حاصل ہے کہ بڑے بڑے محقق آپ کی تحقیق وتدقیق کے قائل ہیں چنانچہ اسی بنا پر آپ کو مناظرہ کا شیر کہا جاتا ہے چنانچہ مناظرہ مباحثات میں وہ ملکہ حاصل ہے کہ صرف آپ ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔

آپ کے اوصاف خصوصی میں آپ کی پابندی اوقات بھی کافی حصہ لئے ہوتے ہے۔ جو کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔

آپ صبح ۵ بجے ہی بستر سے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور پو پھٹتے ہی ملاقاتیوں کی آمد ورفت کا سلسلہ بندھ جاتا ہے اور بشکل تمام دوپہر تک اس

ناہ برہیف بن سریف ہوا جو ہندوستان کے نئے قوانین منصبہ رکی[illegible]

زندہ کرنے کی تجویز پیش ہوئی تو مولانا نے پارلیمنٹری پروگرام کی پوری زور سے حمایت واعانت کی۔ چنانچہ آپ کو ۱۹۲۵ء کے آخر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی پارلیمنٹری سب کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔

گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی پر آپ کا بھاری اثر ہے اور آپ کے قول کو کافی وزن حاصل ہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے اُٹھ جانے کے بعد کانگریسی حلقوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات میں آپ کی رائے بہت وزن رکھتی ہے۔

مولانا سیاسی ہنگاموں اور مظاہروں سے دور رہنا چاہتے ہیں وہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر ٹھوس کام کئے جانا پسند کرتے ہیں۔

مولانا اردو زبان کے بہترین مقرر و خطیب ہیں آپ کی تقریریں خطیبانہ زور کلام ہوتا ہے۔ نپے تلے فقرے، ترشی ترشائی زبان اور روانی اس درجہ کی کہ الفاظ و معنی کا ایک دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ جلسہ عام میں آپ کی تقریر سنکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی شخص مرصع نظم پڑھ کر اُٹھ گیا ہے۔ لیکن اسکی مترنم بازگشت فضاؤں میں بسی ہوئی ہے۔ آپ کی تقریر سننے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ لیکن مولانا بھیڑ بھڑکے سے کتراتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسی بنا پر بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مولانا سے اس حد تک بڑھے ہوئے حجاب کو اکثر

ب تک پہنچ چکا ہے اور وہی جذبہ آزادی اور صداقت شعاری ہے۔
اب حالیہ کچھ واقعات بتاکر آپ کی دوسری صدارت کا ذکر اور اس
جلاس کا خلاصہ تحریر کرتے ہیں جو سنہ ۱۹۴۰ء میں دوسرا تاریخی اور ایک
یصلہ کن اجلاس ہوا تھا۔

آپ نے مسلم لیگ اور کانگریس میں باہمی سمجھوتہ کرانے کی انتہائی
وششیں کیں۔ لیکن آپ کو اس میں ہمیشہ ناکامی اور مایوسی اٹھانی پڑی
ونکہ لیگ کے مطلق العنان قائد اعظم محمد علی صاحب جناح نے ہر مرتبہ
پ کے دست تعاون کو جھٹک دیا اور معقول شرائط صلح کا بھی ابھی غیر
ناسب الفاظ میں جواب ملتا رہا۔

آپ نے دوسرا طریق تعاون کی صورت میں پیدا ہونے کا یہ بھی نہ
چھوڑا کہ بعض سرکردہ لیڈروں سے جو بعض وجوہ خاص کی بنا پر مسلم لیگ
ں شامل ہیں گفتگو کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ موجودہ وقت
ی تخریبی کشمکشوں میں کوئی حصہ لیں اور ایسی تعمیری تجویز پیش کریں جو
س نفاق و افتراق کی لعنت سے ملک و قوم کو آزاد کر سکے لیکن افسوس
ے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہر بار آپ کو یہی جواب ملا کہ مسلم لیگ کے
ائی کمانڈ کے خیال میں ابھی اس کے لئے وقت نہیں آیا۔

پرانی سوراج پارٹی کے احیاء کی کوشش

سنہ ۱۹۳۴ء میں جبکہ ڈاکٹر انصاری کی رہبری میں سوراج پارٹی کو دوبارہ

ارشاد فرمایا تھا کہ ... اگر تم لوگ چاند اور سورج بھی لاکر میرے ہاتھ میں رکھ دو تو بھی میں راہ راست سے نہیں ہٹوں گا۔"

آج مولانا کے لئے اس سے زیادہ آسان اور سہولت کی چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مقابلہ اور جد وجہد کے میدان سے ہٹ کر ابن الوقتی کے دھرے پر چل نکلیں۔ جیسا کہ اون کے کمتر درجہ کے اکثر مسلمان لیڈر کر رہے ہیں۔ اگر آج وہ اپنے پاکیزہ اور قابل ستائش اصولوں کو خیر باد کہہ دیں تو وہ ایک دن میں ۹ کروڑ مسلمانوں کے امام اور مفتی اعظم بنکر مخالفین کو اونکے اپنے ہی حربہ سے شکست دے سکتے ہیں۔

لیکن نہیں وہ خوب واقف ہیں کہ اپنے وطن اور نو کروڑ مسلمانوں کے نزدیک اون پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔ اور وہ ہزار ہا مصیبتوں کے باوجود قوم اور ملک کے اہم مفاد کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ اگر امان کی تمام قوم گمراہ یا جاہل لوگوں کے بہکانے میں آکر اون کا ساتھ چھوڑ دے اور وہ تن تنہا رہ جائیں تب بھی وہ اوس راستہ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ جس کے متعلق انہیں یقین ہے کہ یہ صحیح اور سیدھا راستہ ہے۔

کیونکہ آپ نے علم کی روشنی میں اوس راہ نجات کو پا لیا ہے جس پر مضبوطی سے قائم رہنے سے ہی موجودہ مشکلات و صعوبات سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ دوسرے آپ کے سامنے اپنے خاندانی احترام و تقدیس کو اپنے آباؤ اجداد کی طرح برقرار بھی رکھنا ہے۔ اور اپنے اوس ورثہ کو خاک میں ملانا مقصود نہیں جو تیرہ سو برس سے نسلاً بعد نسلاً

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ کہ جمعیتہ العلماء ہند کا قیام بھی ظہور میں آ چکا ہے۔ کہ جمعیتہ العلماء ہند کا قیام بھی ظہور میں آ چکا تھا۔ چنانچہ آپ اوس کی بھی ابتدا ہی سے اوس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور آج تک اوس جماعت کی تقدیس و بزرگی اور خلوصیت کے سبب اوس سے متعلق ہیں۔ اور مسلمان دین کی اس متبرک اور راسخ جماعت سے ہم خیالی اور میل جول کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

گو تمام اعتدال پسند در جمعیت پسند لوگ جن کا رسوخ اور اثر علماء مقتدر کی اسی جماعت یعنی جمعیتہ العلماء ہند نے گزشتہ دور میں خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا آج اسلام کے نام پر مسلم لیگ شور کرتے اور مسلمانوں کے خطرہ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں مگر مولانا آزاد ہیں کہ اون کے پائے استقلال میں شروع سے لے کر اب تک ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ وہ اسلام کی حقیقی سپرٹ اور صحیح تعلیم پر کاربند ہیں۔ کیونکہ اسلام صحیح قسم کی وطنیت سکھاتا ہے اور اوس تنگ نظری و تعصب کا دشمن ہے جو نسلی یا قبائلی عصبیت کی پیدا کردہ ہو مولانا بڑی سختی اور مضبوطی و راسخ الاعتقادی کے ساتھ اسلام کی قدیم روایات اور پرانے اصولوں پر قائم ہیں اور اس شان استقلال کے ساتھ قائم ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اون کے قدم کو ڈگمگا نہیں سکتی۔

آپ کے پیش نظر اس مسئلہ میں اپنے آقائے محترم رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بلند مثال ہے جو بتوں کی مذمت ترک کرنے کے سلسلہ میں عرب نے آپ کی خدمت میں تاج و تخت کی صورت میں پیش کیا تھا اور آپ نے جوا

مصروف رہتے تھے کہ کسی دوسرے کام کے لئے وقت نکالنا
بہت ہی مشکل تھا مگر طبیعت میں اسلامی تڑپ اور کسی ٹھوس مضبوط
اور دائمی اسلامی خدمت کے کرنے کا ارادہ ایک عرصہ سے دل میں
دبائے ہوئے تھے۔ اور خواہش تھی کہ مسلمانوں کے لئے اونکی دینی اور
مذہبی کتاب یعنی قرآن مجید و فرقان حمید کی تفسیر لکھوں جو مسلمانوں کے موجودہ
مذہبی عقائد کو اتنا صحیح اور درست کرنے والی ہو جیسے کہ قرن اول کے
مسلمانوں کے عقائد تھے۔ اور کوئی ایسا نقص اور رسمی خیالات کی بنا
پر قائم ہو جانے والی کوئی خرابی و بدعت اون میں باقی نہ رہے۔ چنانچہ آپنے
۱۹۲۴ء میں اس شاندار اور مبارک مگر اہم کام شروع کر دیا۔

آپ ترجمان القرآن کلکتہ میں مرتب کرتے اور دہلی کے ایک پریس میں
اوسکی طباعت کرا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کو اکثر دہلی آنا پڑتا تھا
چونکہ اس بار بار کی آمد و رفت کافی قیمتی وقت لے لیا کرتی تھی اس لیے آپنے
۱۹۲۴ء ہی میں کلکتہ اور دہلی دونوں جگہ باری باری سکونت اختیار کرنے
کا فیصلہ کیا۔

مگر اپنے اس طریق سکونت کو آپ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رکھ سکے اور ان
گوناگوں مصروفیتوں کی تاب نہ لا کر آخر کار پھر کلکتہ ہی میں مستقل طور پر رہنے
لگے۔ ترجمان القرآن آپ کی مقبول اور بہترین کتاب ہے۔

مولانا آزاد آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں مدرس کے

تاکہ نقصان دہندہ قوانین کی تردید اور مفید قوانین پاس کرانے کی کوشش کی جاسکے۔

چنانچہ اس طریق کار کو پارلیمنٹری پروگرام کہا گیا۔ غیر پارلیمنٹری پروگرام تھا جس کے تحت اوسوقت کام ہوتا رہا۔ یعنی حکومت کے کسی محکمہ اور کسی ادارہ اور کسی اسمبلی میں بغیر کسی قسم کا حصہ لئے باہر رہ کر یعنی علیحدہ رہ کر قومی اور ملکی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسی طریق کار پر جس قسم کی ضرورت ہوتی کر زبانی تک سے دریغ نہ کریں۔ لہٰذا اس طریق کار کے غیر پارلیمنٹری پروگرام کہا گیا اور کہا جاتا تھا لہٰذا اب خلاصہ کے طور پر مکرر تحریر ہے کہ مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور ڈاکٹر انصاری اور بہت سے ان مخلص ہمدردان قوم کے دیگر ہم خیال غیر پارلیمنٹری طریق کار کی حمایت میں تھے اور اسی طریقہ کو ملک و قوم کے لیے مفید اور کامیاب سمجھتے تھے۔

اور مولانا ابوالکلام آزاد و حکیم اجمل خاں صاحب و دیگر بہت سے ان کے ہم خیال اصحاب پارلیمنٹری پروگرام اور غیر پارلیمنٹری پروگرام دونوں طریقہ کار کو قائم رکھنا چاہیئے اور ضرورت وقت کے تحت لازمی اور مفید سمجھتے تھے۔

لہٰذا وہ وقت ہے اور آج کا دن کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے اسی نظریہ کی تائید حمایت میں ہیں کہ پارلیمنٹری اور غیر پارلیمنٹری پروگرام کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔ جیسا کہ اوپر بھی تحریر کیا جاچکا ہے۔

دہلی اور کلکتہ میں سکونت

آپ سیاسی مصروفیتوں ملکی و قومی خدمت وغیرہ ادبی مشاغلوں میں اس قدر منہمک

فرصت پاکر اپنی زندگی قلم اور دوات کی صحبت میں بسر کردیں۔ لیکن سیاسی حالات اور ملکی وقومی ضروریات کی نزاکت آپ کے سامنے اس قدر نمایاں ہے اور کروڑوں ایسی ہی ضروریات کا جو مفاد عالم سے متعلق ہیں اس قدر احساس ہے کہ وہ اپنے دل کے محبوب ترین ارمانوں اور زریں وخوشنما آرزؤں کو قربان کر رہے ہیں اور کر سکتے ہیں لیکن اوس صدائے عمل پر جس کا غلغلہ آج ہندوستان کے طول وعرض میں بلند ہے لبیک کہے بغیر نہیں رہ سکتے اور کوئی شخص جو آپ کی خوبیوں سے واقف ہے آپ کی دلآویز شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اب اس سے پہلے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح کے متعلق دوسری اور اختتامی باتیں درج کردوں بہتر ہے کہ پہلے وہ خطبۂ صدارت جو آپنے انڈین نیشنل کانگریس کے ترپنویں اجلاس میں جو رامگڈھ میں منعقد ہوا ہے بجنسہٖ پیش ناظرین کردوں تاکہ تسلسل مضمون قائم رہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کا

تریپنواں اجلاس رام گڑھ

امیر الملک مولانا ابو الکلام آزاد کا خطبۂ صدارت

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے۔ قوموں کی جدوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے۔ کہ اب وقت کے پرانے انداز سے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا۔ کہ مختلف منزلوں سے گزرے۔

ہم ہر منزل میں ٹھہرے مگر رکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا۔ مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے ہی کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا

ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے نہ چل سکے ہوں۔ لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دیگا۔ ۲۳ء میں ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اُس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھائیے۔ اور سامنے کی طرف دیکھئے۔ نہ صرف منزل کا نشان صاف دکھائی دے رہا ہے۔ بلکہ خود منزل بھی دور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے۔ ہماری جد وجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور، اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے۔ وہاں طرح طرح کی نئی اور اُلجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔

ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش اُن کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بالکل نزدیک کر دے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں اُلجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے جس بھروسے کا اظہار کیا۔ ہے

وہ یقیناً طریقے سے بڑا بھروسہ ہے۔ جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ آپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزت ہے۔ اسلئے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزت کے لئے شکر گزار ہوں۔ اور ذمہ داری کے لئے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا اصلی سوال

اب میں سمجھتا ہوں، مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آجانا چاہیئے۔

ہمارے لئے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں۔

غالباً کانگریس کی تاریخ میں اُس کے ذہنی نقشہ کا یہ ایک نیا رنگ تھا۔ کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین الاقوامی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک ملکی تجویز منظور کر کے اُس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا۔ اور اُس کے بعد سے وہ کانگریس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے

میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا۔ جو ہم نے دُنیا کے سامنے کر دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دُنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا:—

سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آجکل کی مجبوری کی حالت میں بھی دُنیا کی سیاسی صورتِ حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے۔ ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں۔ بلکہ اس سے باہر کی دُنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانہ کی بےشمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے۔ اور فکر اور عمل کی لہریں ایک گوشے میں اُبھر کر اس تیزی کے ساتھ دُوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں، ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے کہ باہر کے حالات، ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں کا دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا۔ جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی۔

ہم نے ان تجویزوں کے لیے اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت

اور افرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشسزم اور نالسٹی ازم کی جو ارتجاعی (...) (Reaction ary) (ری ایکشنری) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں۔ ہندوستان انھیں دُنیا کی ترقی اور امن کے لئے ایک عالمگیر خطرہ تصوّر کرتا ہے۔ اور اس کا دِل اور دماغ اُن قوموں کے ساتھ ہے، جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فیشی ازم اور نالسٹی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا۔ تو ہمارے لئے ناممکن تھا کہ ہم اُس پرانے خطرے کو بھلا دیتے۔ جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لئے مہلک ثابت ہو چکا ہے۔ اور جس نے فی الحقیقت ان نئی اور ارتجاعی (Reactionary) تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہونچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم ان نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی طرح دُور سے نہیں دیکھ رہے۔ یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لئے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات کھول دی۔ کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی تو ہندوستان جو اپنے آزادارادے اور آزادپسند سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی حصّہ نہیں لے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصّہ لے سکتا ہے، جبکہ اُسے

اپنی آزادمرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔
نازیسی ازم اور فیسٹی ازم سے بیزار ہے مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی
شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی
حق سے محروم رہتا ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ برطانوی
شہنشاہیت اپنی تمام روایتی (Traditional
خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے اور ہندوستان کسی حال میں تیار نہیں
کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لئے مدد دے۔
یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔
یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست ۱۹۳۹ء تک
منظور ہوتی رہیں۔ اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور ہیں۔
کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے، کہ
اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتہ میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے۔
اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہو گئی۔
اب میں اس موقعہ پر ایک لمحہ کے لئے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا
اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھئے پچھلے اگست کو آپ نے
کن حالات میں چھوڑا ہے۔؟
برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء ہندوستان
کے سر جبراً تھوپا۔ اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش
کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط

دے دی ہے۔ کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دُنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصے کے لئے دم لینے کا ارادہ کیا۔ اور اس پر آمادہ ہوگئی۔ کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرلے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کررہی تھیں۔ اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدّت تک قائم رکھا جاسکتا ہے قائم رکھے۔

ساتھ ہی صورتِ حال کا ایک دُوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صوُرت کا تعلق ہے، ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمن سے اپنی بیزاری کا اعلان کرچکا تھا۔ اُس کی ہمدردیاں۔ جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں۔ اور صورتِ حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جاسکتی تھی۔ کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت (Mentality) میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی۔ (Diplomacy) ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کرے گی۔ کہ اس موقعہ پر اپنا پُرانا ڈھنگ بدل دے۔ اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے۔ کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب وہوا میں سانس لے

رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیا رہا ہے۔
تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اُسی طرح جیسا کہ اُس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی خاصہ رہا ہے۔ اُس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرلیا۔ اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کس درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقعہ دیا گیا ہو۔ لڑائی میں اس کے شامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ اُن نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقعہ دیدیا جائے۔ جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔!
تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے۔ کہ اس موقعہ پر برٹش ایمپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کینڈا۔ اسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ۔ جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے اس فیصلے پہ برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔
مسٹر ڈی ولیرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف

کہدیا تھا۔ کہ جب تک آلسٹر (Ulster) کا سوال قابلِ اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا ، وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے۔؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سُنائی جارہی ہے۔ کہ اُسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کا درجہ (Status) ملنے والا ہے۔ اس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا۔؟

اس طرح کہ اُسے دُنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اُسے معلوم بھی ہوا کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔!

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لئے کافی ہے۔ کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اُس کے اصلی رنگ رُوپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دُور نہیں۔ جب ہم اُسے اور زیادہ نزدیک سے اور اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے۔!

سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سُلگی تھی۔

اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ
لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یادش بخیر، پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے
دنیا کے سامنے آئے۔ اور اُن کا جو کچھ حشر ہوا۔ دُنیا کو معلوم ہے۔ اس
مرتبہ صورت حال دُوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس
نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔
اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردّ عمل (Reaction) شروع
ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فیشزم اور جرمنی میں
نازیزم کا رُوپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر
بے روک آمریت (Dictatorship) دنیا کے امن اور آزادی
کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی، تو قدرتی طور پر
دو نئی صفیں دُنیا کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ ایک جمہوریت
اور آزادی کا ساتھ دینے والی۔ دُوسری ارتجاعی۔
(Reactionary) قوتوں کو آگے بڑھانے والی اور اس طرح
لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔
مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لئے فشسٹ اٹلی اور
نازی جرمنی سے کہیں زیادہ سویٹ رُوس کی ہستی ناقابلِ برداشت
تھی۔ اور جو اُسے برطانی سامراج کے لئے ایک زندہ چیلنج
سمجھتی تھی۔ تین برسوں تک اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا
ہی نہیں، بلکہ اس نے اپنے طرزِ عمل اور کھلے طور پر فشسٹ

اور نازی قوتوں کی جرأتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ایبے سینیا۔ اسپین۔ آسٹریا، چیکوسلاواکیا۔ اور البانیہ، کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دُنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔ اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے اُنھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔

لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں اُبھر آیا۔ اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا۔ تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہو گئی۔ اُسے لڑائی کے میدان میں اُترنا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اُترتی۔ تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ اب چھوٹی قوموں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ "جمہوریت" آزادی اور عالمگیر امن کے لئے نعروں نے لے لی۔ اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔

۳ ستمبر کا اعلان جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دُنیا کی اُن تمام بے چین رُوحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بد امنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں۔ ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دئے۔

کانگریس کا مطالبہ

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۸ ستمبر کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی۔ تاکہ صورت حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقعہ پر کیا کیا؟

کانگریس کے وہ تمام اعلان اُس کے سامنے تھے۔ جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلان جنگ کے بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا گیا تھا۔ وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اُسے ملامت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی۔ جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اُس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دِل و دماغ کی نگرانی کی۔ اُس نے وقت کے اُن تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کر رہے تھے۔ اپنے کانوں کو بند کر لیا۔ اس نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر پُورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اُٹھایا، جسے آج ہندوستان سر اُٹھا کر دُنیا سے کہہ سکتا ہے۔ کہ اس صُورتِ حال میں اُس کے لئے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر کے اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دُنیا کے سامنے رکھ دے۔ جس پر نہ صرف ہندوستان کا، بلکہ دُنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر

اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے
تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جارہی ہے؟
اس کا مقصد کیا ہے؟

اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (Tragedy)
کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے۔
اور یہ واقعی اس لئے لڑی جارہی ہے، کہ آزادی، جمہوریت، اور
امن کے ایک نئے نظم (Order) سے دنیا کو آشنا کیا
جائے۔ تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبے کا حق حاصل ہے۔
کہ وہ معلوم کرے، خود اس کی قسمت پران مقصدوں کا کیا اثر پڑیگا
ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبہ کو ایک مفصل اعلان کی
صورت میں مرتب کیا۔ اور ۱۴ ستمبر ۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔
اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ
میں اپنے لئے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کریگا تو مجھے یقین ہے
میں آنے والے مؤرخ سے کوئی بیجا توقع نہیں کررہا ہوں
یہ سچائی اور معقولیت (Reason) کا ایک سادہ
مگر ناقابل رد نوشتہ (Document) ہے جس کو صرف مسلح طاقت
کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کرسکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی
لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی۔ یہ عالمگیر انسانیت
کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس ۲۵ برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت

کے ایک سب سے بڑے عذاب میں، جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں، مبتلا کی گئی - اور صرف اس لئے مبتلا کی گئی، تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے - کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت خود اختیاری فیصلہ (Self-determination) ہتھیاروں کی حد بندی، بین القومی (Inter national) پنچایت کا قیام - یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں شگفتہ کی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا - ؟

ہر صدا فریب نکلی - ہر جلوہ خواب وخیال ثابت ہوا - آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جارہا ہے - کیا معقولیت (Reason) اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہوجانا چاہیئے، کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کرسکتے - کہ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا -

برطانوی حکومت کا جواب
اور
کانگریس کا پہلا قدم

کانگریس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا - جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے

اس سلسلے کی پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے۔
جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومت ہند
کے سرکاری علم و ادب (Official Literature) کے اُلجھے
ہوئے انداز، اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے
صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی۔ اس قدر بتانے پر بمشکل آمادہ
ہوتا ہے۔ کہ لڑائی کے مقصد کے لئے برطانوی وزیر اعظم کی ایک تقریر
پڑھنی چاہیئے۔ جو صرف یورپ کے امن اور بین الاقوامی۔۔۔
(International) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے "جمہوریت"
اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جاسکتے۔ جہاں تک
ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے وہ ہمیں بتاتا ہے۔ کہ برطانوی حکومت
نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ اور
جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا۔ آج بھی وہی پالیسی اُس کے سامنے
ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔
۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا۔ اور ۲۲ اکتوبر کو
ورکنگ کمیٹی اُس پر غور کرنے کے لئے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث
کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اُسے مطمئن نہیں کر سکتا۔ اور
اب اُسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیئے جو اس وقت تک اُس نے
ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا وہ اُس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے۔
ان حالات میں کمیٹی کیلئے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی

پالیسی کو منظور کرے۔ کیمٹی کانگریس وزارتوں کو ھدایت کرتی ہے
کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے
بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں
چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفےٰ دیدیا۔ یہ نواس سلسلہ
کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرکے
کہاں پہنچتا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونکے جو ۵ / فروری کو دہلی
سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے۔ جو مہاتما گاندھی
سے ہوئی تھی۔ اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انھوں نے ۶ / فروری
کو شائع کیا۔ اس کی آخری کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو
معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے۔ کہ
ہندوستان جلد سے جلد وقت میں جو صورت حال کے لحاظ سے ممکن ہو۔
برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کرے۔ اور درمیانی زمانے کی
مدت جہانتک ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے
لئے تیار نہیں۔ کہ بغیر باہر کی مداخلت کے ہندوستان اپنا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن)
خود اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے اور اپنی قسمت کا
فیصلہ کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان
کے لئے خود اختیاری (Self-determination) کا حق تسلیم
نہیں کرسکتی ۔
حقیقت کی ایک جھوت۔ (Jhoot) سے دکھانے کا سارا

طلسم کس طرح نابود ہو گیا۔ پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں، وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔

مگر جونہی ہندوستان نے یہ سوال اٹھایا، حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے۔ مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں۔ مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ر فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے۔ اگرچہ اُن کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ اُنھوں نے ہمارے لئے برطانوی حکومت کے صاف طرزِ عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں۔

ہماری لڑائی اس لئے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کریں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ اپنی آزادی کو بیجا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقعہ پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانی نہیں ہے۔ بلکہ

ٹھیک ٹھیک برِاعظم یورپ کی اُس عام ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جو تقریباً دو صدیوں سے دُنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انسان کے انفرادی اور جماعتی آزادی کے جسقدر اصول قبول کیے گئے۔ ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لئے خاص سمجھا گیا۔ اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جا سکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے۔ کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں۔ اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنھیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ وہ انسانی حقوق کیلئے یورپ کا امتیازی نشان ہے،

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جب اعلانِ جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا۔ کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے۔ اور ہندوستان کی قسمت پر کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے۔ کہ برطانوی حکومت کی پالیسی سنہ ۱۹۱۷ء اور سنہ ۱۹ء میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے۔ کہ سنہ ۳۹ء کی اُس دُنیا میں جو دلوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے۔ ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے۔ اُسکی جگہ اب بھی بدلی ہے

یا نہیں ؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی اپنے سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اسکی خواہشمند ہے کہ ہندوستان جہانتک جلد ممکن ہو نوآبادیات (Dominion Status) کا درجہ حاصل کرے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ وہ اس کی "بہت زیادہ خواہشمند ہے" مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے۔ یہ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دیگا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی ؟

جہانتک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لئے صورتِ حال بالکل واضح ہوگئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسیطرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لئے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند

نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جارہی ہے۔

آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا۔ کہ ۳ ستمبر کے اعلانِ جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں۔ اس کا رُخ کس طرف ہے۔؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اسوقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف اُبھر آیا ہوگا۔ کہ اب اُسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپکے لب ہلیں میں آپ کے دلوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون (Co-operation) کا جو قدم ۱۹۳۸ء میں اٹھایا تھا۔ ہم نے اعلانِ جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لئے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترکِ تعاون (Non-co-operation) کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔؟ جب قدم اٹھا دیا جائے تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر رُکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں۔ جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے۔

باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے جبکہ دُوسری طاقت اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی (Reactionary) قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ و بالا کر دیئے۔ اور انصاف اور معقولیت (Reason) کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کیلئے کھلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ ابھار رہی ہے وہاں اُمید کا ایک دُوسرا رخ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بیشمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے جو نہایت تیزی کیساتھ ہر طرف اُبھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پُرانے نظم (Order) کی نامُرادیوں سے تھک گئی ہے۔ اور معقولیت، انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کیلئے بیقرار ہے۔ دُنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی رُوحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا۔ اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر اُبھر رہی ہے اور اس طرح اُبھر رہی ہے کہ شاید تاریخ میں کبھی نہیں اُبھری۔ ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں سے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اسکے پُرانے فیصلوں کے

حالات ایک نئے مسئلہ کا اضافہ ہوتا ہے۔ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں
جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا
آئندہ کے لئے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے
کے لئے تیار ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کسطرح امید و نئی ایک نئی
زندگی میں بدل جائیں۔ معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کسطرح
دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر
فتحمندی ہوتی، اگر آج برطانی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ
میں ایک مثال بڑھانے کا کام انجام دیدیا ہے۔

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے، مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے۔
وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن
پہلو ہے۔ جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی
مفاہمت کے دروازے میں جو ان پر کھولا جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اپنی
جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں بلا تامل قدم رکھنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔

برطانوی کابینہ (Cabinet) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد
دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم
ہو چکا۔ اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے
سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان سے بڑھکر اور کون سا ملک ہو سکتا ہے۔
جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود
ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن اور انصاف
کی راہ روکے کھڑا ہے۔ جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ
اس طرح کے تمام دعووں کے لئے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعویٰ کسوٹی پر

کیے گئے اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے۔

جہانتک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے۔ معاملہ اسکے سوا کچھ نہیں ہے جو میں نے اختصار کیساتھ آپ کے سامنے رکھدیا۔ گزشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا، تو اسوقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے۔ اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جاسکیگا۔ بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جاسکتیں جہانتک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں۔ اور براہ راست اقدام عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کر لیا ہے متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہانتک ملک کی آزادی اور اُس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے۔ ہندوستان کی ذہنی بیداری اب اُن ابتدائی منزلوں سے بہت دُور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے اختلاف کرنے کی جراءت کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کیلئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں۔ وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضہ سے بے بس ہو رہی ہیں اور انھیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورت حال کے دُوسرے گوشوں پر سے پردے اُٹھا دئیے۔ وہاں اس گوشے

کو بھی بے نقاب کر دیا — ہندوستان اور انگلینڈ دونوں جگہ یکے بعد دیگرے
اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ
مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کرکے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے
بار بار دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی۔ کہ ہندوستان کے
سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔
اگرچہ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان میں برطانوی
شہنشاہی کا یہ طرز عمل رہ چکا ہے۔ کہ ملک کے باشندوں کے
اندرونی اختلافات کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے۔ اور
پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لئے کام میں لائے۔
تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔
اور ہمارے لئے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے
جذبات میں گرم آہٹ پیدا کریں۔
ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند
نہیں ہوسکتی۔ جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لئے سب سے
بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کو باور کرانے
کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی
تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا۔
یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی۔ اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید
رکھتے تھے۔ کہ کم از کم اس گوشے میں وہ اپنے طرز عمل کو پچھلے

عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پچھلے پانچ
مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے۔ اُس نے ثابت کر دیا
کہ ابھی ایسی اُمید دل کے رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ اور جس دَور کی نسبت
دُنیا کو یقین دلایا جا رہا ہے۔ کہ ختم ہو گیا۔ اُسے ابھی ختم ہونا
باقی ہے۔

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں
کہ دُنیا کے تمام مُلکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل
رکھتا ہے اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا
ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے اور ہمیں رکھنی بھی
نہیں چاہیئے۔ کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی
یہ مسئلہ موجود ہے۔ اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض
ہے، کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں۔
کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پروا رہ کر اُٹھے گا۔ یقیناً ایک
غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے
معنی صرف یہی ہونے چاہئیں۔ کہ اُس کی موجودگی کا اعتراف کیا
جائے۔ یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ اُسے ہندوستان کے قومی حق
کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی
ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔

اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دَور ختم کرنے پر

مائل ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے۔ وہ یہی گوشہ ہے۔
کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لئے جو جگہ بنائی ہے وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اول دن سے دعویٰ رہا ہے۔ کہ وہ ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے۔ ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ کانگریس نے یہ دعویٰ کر کے دنیا کو اس بات کا حق دیدیا ہے۔ کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے اُس کے طرز عمل کا جائزہ لے۔ اور کانگریس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھکر ہم آج کانگریس کے طرز عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے۔ اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی۔ اس کی اہمیت۔ اُس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اُس نے اس کے فیصلہ کے لئے وہی طریقہ تسلیم کیا۔ جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارے میں

کوئی نہیں بتلایا جا سکتا ہے۔ تو اس کی طلب میں دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے۔ اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ بہتر سے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لئے سب سے پہلی شرط تعین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے۔ اور جب بھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا:۔

(۱) ہندوستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے، اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے۔

(۲) اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لئے کن کن تحفظات ۔ ۔ ۔ (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لئے جج خود اقلیتیں ہیں نہ کہ اکثریتیں۔ اس لئے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیئے نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا

اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرز عمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرزِ عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے۔ جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگریس اپنے ادا کئے فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس ۱۹ برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس ۱۹ برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گزرا۔ جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کر نیکا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا۔ اُس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرز عمل تھا۔ پچھلے پندرہ ۱۵ برسوں کے اندر بار بار اس طرز عمل کے لئے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں۔ مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی) کے سلسلے میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے۔ وہ اس کے لئے کافی ہے۔ کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر

وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمایندوں کو چن کر بھیجیں۔ ان کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رائے رکھے ہوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہانتک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے۔ فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی۔ خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے تو کسی غیر جانب دار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے۔ ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابلِ عمل تجویز ہو سکتی ہے تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرز عمل سے یہ اصول سامنے رکھ لئے ہیں۔ اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے۔ تو پھر اس کے بعد اور کون سی بات رہ گئی ہے۔ جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے۔ کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟

اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی ہے۔ تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقعہ نہیں دیدیتی۔ کہ ہم سب ملکر بیٹھیں اور باہمی رضامندی؟

سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے تصفیہ کر لیں ؟

ہم میں تفرقے پیدا کیئے گئے۔ اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے۔ کہ ہم میں تفرقے ہیں ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہئیں یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں کیونکہ ہماری راہ تمامتر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے۔ اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں۔ ؟

مجھے نہیں معلوم، آپ لوگوں میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے

میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے
موجود ہیں تو میں اُن سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں
میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا۔ اور
اُسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں
کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے۔ جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان
کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لئے
انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف
سے اندیشہ ناک رہنا چاہیئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بیشمار غلط
فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں
چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی
حیثیت مشتبہ کر دی۔ دُوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا
کر دیا۔ جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں
نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ
غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن
ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اُسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار
ہے۔ جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے
بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا۔ اور
جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس سیاسی بیداری کے خلاف استعمال

کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے، اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں اسوقت زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنی چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق "وائسرائے ہند" لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیئے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے۔ اُن میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً اپھول پتے پیدا کئے۔ اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اُس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اُس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دُوسری تعداد سے کم ہو۔

زمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے سا ور اُسے اپنی حفاظت کی طرف سے
مضطرب ہونا چاہئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے
جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی
کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود
اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی
نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی
ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت
کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ
نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک
ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے دوسرے
کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اسلئے
دو کروڑ سے کم ہوگا۔ مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف
اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اُسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزوریتی
کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے
نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل Factors کی موجودگی
بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی
حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ
صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے۔ کہ آپ کے سامنے ایک عظیم

گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے
کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح
دھوکا دینا ہے۔

اُس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ
ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی
نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط
رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ
رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے
زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے۔
خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی تعداد کی اتنی عظیم
مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے
کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی
نگہداشت خود نہیں کر سکے گی۔؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص تقسیم
کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے
گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی
ہے۔ اور [illegible] تعلیم کی حیثیت سے کہیں [illegible] گرد
برٹش [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] مسلم اکثریت
کے پانچ [illegible] کی [illegible]

ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں، تو بھی اس تصور میں مسلمانوں
کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت
کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے
ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیتی گروہ ہونے کا
احساس مضطرب کرسکے۔

ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (Constitution) اپنی
تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو۔ مگر اس کی ایک بات ہم سب کو
معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation)
کا جمہوری دستور ہوگا۔ جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے
اندرونی معاملات میں خودمختار ہوں گے۔ اور فیڈرل مرکز کے
حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے۔ جن کا تعلق ملک کے عام اور
مجموعی مسائل سے ہوگا۔

مثلاً بیرونی تعلقات دفاع (Defence) کسٹم وغیرہ۔۔
ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے
پوری طرح عمل میں آنے اور [illegible] شکل [illegible] چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر
کے لئے بھی اپنے [illegible] سکتا ہے [illegible] قبول کرنے
کے لئے تیار ہو جائے جنھیں اکثریت اور اقلیت [illegible] سوال
[illegible] کوشش کی ہے [illegible]
[illegible] مستقبل کے نقشے میں [illegible]

نکل سکتی ہے۔

دراصل یہ تمام اندیشے اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے۔ ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں۔ اور گو تیرنا چاہتے ہیں۔ مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بےخوف وخطر کود نا چاہیئے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا ہم معلوم کرلیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔

مسلمانانِ ہند کیلئے ایک بنیادی سوال

تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے لئے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جد وجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی، اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی راہ اختیار کرلی گئی تھی۔ وقت کی یہ عام آب وہوا میرے غور وفکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا۔ اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ۔ ۔ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔

اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں۔ اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کر لیں۔

یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں اس کی بنیادوں تک اتریں، اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا، اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟

اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستور اساسی کا کوئی تحفظ، ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں اور ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہیئے۔ کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لئے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیئے۔ تو پھر ہماری راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔

ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی، اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، جماؤ، عمل اور سرگرمی کا شور رخ یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ نہ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اُٹھائے بڑھے جائیں!

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں۔ میں کسی مسلمان کے لئے۔ بشرطیکہ اُس نے اسلام کی رُوح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈھ کر نکال نہ پھینکی ہو۔ یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے!

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا، اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے آخر میں جب چار برس کی نظر بندی کے بعد میں رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے۔ اور نیا سانچا

ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیتیس برس گزر چکے۔ اس عرصے میں طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لئے تیار نہیں۔

ہاں! وہ اب پیچھے لوٹنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اُس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا۔ کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے اُنھیں مخاطب کیا تھا۔ آج بھی میں اُسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ اُن میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے۔ میں اُن کے اندر کھڑا رہا۔ اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں اُن سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی اُن سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں اُنھیں

دعوت دی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا۔ مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے۔ میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا۔ مگر میں اُن کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے۔ ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیئے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کر لیں۔ وہ اس کے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

مسلمان اور متحدہ قومیت

میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم۔ اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فن، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے

کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی رُوح مجھے اُس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں۔ مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور پھر ایک کے بعد سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی۔ اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے

نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لئے بس گیا۔
یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔
ہم اپنے ساتھ ذخیرہ لائے تھے۔ اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اُس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دئے۔ ہم نے اُسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دیدی۔ جس کی اُسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اُسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔
تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوی کرتا ہے۔ جیسا دعوے ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے۔ تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح ایک ہندو

فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اور ہندو مذہب کا پیرو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیح کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا۔ کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے۔ کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اور باشندگانِ ہند ایک مذہب یعنی عیسائیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے ہماری زبانیں، ہماری شاعری۔ ہمارا ادب۔ ہماری معاشرت۔ ہمارا ذوق۔ ہمارا لباس۔ ہمارے رسم و رواج ہماری روزانہ زندگی کی بےشمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔

ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی

واپس لائیں تو نہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔

اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (Revival) مذہب میں ضرورت ہے مگر معاشرت میں ترقی سے انکار کرتا ہے۔

ہماری ایک سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضامند ہو جانا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔

خاتمہ

حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں۔ مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجئے۔

آج ہماری کامیابیوں کا دار و مدار تین چیزوں پر ہے۔ اتحاد ڈسپلن اور گاندھی جی کی رہنمائی پر اعتماد یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دی ہے۔ کوشش کیجئے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں ؂

صرف ۳ کے ٹکٹ روانہ کرکے

مفت حاصل کرو!

ناول مریم کی زندگی

یعنی

دہلی کی حسین وجمیل دوشیزہ

یہ کتاب بہت کم تعداد میں رہ گئی ہے۔ لہٰذا جلد از جلد طلب فرمائیں

نونہال بکڈپو دریا گنج دہلی

تجارت بذریعہ

فنِ [illegible]

اگر چہ آپ صرف قلم اور دوات سے بذریعہ اشتہار بازی دولت کمانا چاہتے ہیں تو آج ہی ہم سے کتاب قانون اشتہار طلب فرمائیے۔ اس فن کی کتاب آج تک آپ کی نظر سے نہ گزری ہوگی۔ دولت پیدا کرنے کے اس قدر آسان طریقے درج ہیں کہ ہر شخص ان پر عمل کر کے تھوڑے ہی دنوں میں امیر و کبیر آدمی بن سکتا ہے۔ آج دنیا اشتہار بازی سے لاکھوں روپیہ پیدا کر رہی ہے پھر آپ اپنی بیکاری سے کیوں مایوس و پریشان ہیں؟ بیکاری کو تجارت کے ذریعہ دور کر لیجئے گھر بیٹھے روپیہ کمائے جائیے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ نہایت ہی بہترین اور قسم کا اعلیٰ۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ آنے (۱۲) محصول ڈاک بذمہ خریدار۔

نونہال بک ڈپو کوچہ دکھنی رائے دریا گنج دہلی سے طلب کیجئے